فنِ صحافت
پروفیسر ظہور الدین

# فنِ صحافت

پروفیسر ظہور الدین



انٹرنیشنل اُردو پبلیکیشنز
922، کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج،
نئی دہلی۔110002، فون: 23270284

ISBN : 81-88368-19-9

قیمت : ایک سو پچاس روپے -/150

اشاعت اول : 2006ء

طباعت : کلاسک آرٹ پرنٹرز، دریا گنج، نئی دہلی۔2

ناشر : انٹرنیشنل اُردو پبلیکیشنز

922، کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج،

نئی دہلی۔110002

FUN-E-SAHAFAT

*Prof. Zahoor-ud-din*

Rs. 150/-

INTERNATIONAL URDU PUBLICATIONS

*922, Kucha Rohella Khan, Daryaganj,*

*New Delhi-110002, Ph. : 23270284*

## کچھ اس کتاب کے بارے میں

۲۰۰۱ء میں جب جموں یونی ورسٹی نے شعبۂ اردو کے تحت "ایم اے اردو پروفیشنل" کے عنوان سے ایم۔ اے اردو کے بعد کے دوسالہ کورس کا آغاز کیا تو سب سے پہلی دقت جو سامنے آئی وہ اس کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کتب کی فراہمی تھی۔ صحافت اور ترجمے کے سوائے کمپیوٹر، ریڈیو اور ٹی وی کی اصناف سے متعلق مواد نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر ہماری ضرورت صرف تاریخی مواد حاصل کرنے تک محدود نہ تھی بل کہ ان فنی و تخلیقی امور پر زیادہ مشتمل تھی جن کو جانے بغیر کورس سے انصاف نہیں کیا جا سکتا تھا، کیوں کہ اس کورس کا بنیادی مقصد طلبہ میں صحافت، ترجمہ، کمپیوٹر الیکٹرانک میڈیا کی ذمے داریوں کو کما حقہ' نبھانے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تا کہ وہ روزی روٹی کے مسائل حل کر کے ایک باوقار زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔ چنا چہ اس کورس کے سربراہ کی حیثیت سے اس مواد کو تیار کرنے کا کام بھی میرے کندھوں پر آن پڑا۔ چناں چہ درس و تدریس کے ساتھ ہی ساتھ اس مواد کی تیاری کا کام بھی ہاتھ میں لیا گیا۔ زیرِ نظر کتاب انھیں ذمہ داریوں کو کماحقہ' نبھانے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ صحافت پر اگر چہ کچھ اچھی کتابیں سامنے آچکی ہیں پر اُن میں سب سے بڑی کمی اُس تربیتی مواد کا نہ ہونا ہے جو اِس کورس کی سب سے بڑی ضرورت

ہے یعنی پریکٹیکلز کے لیے مناسب مواد کی فراہمی ۔ مثلاً ایڈیٹوریل، خبر، کالم، شہ سرخی، سرخی، لکھنے کے لیے کس طرح کا تربیتی مواد تیار کیا جائے جس کو اُسی طرح ورک شاپ میں برتا جا سکے جس طرح سائنس لیبارٹری میں تجربے کیے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ زیرِ نظر کتاب کی وساطت سے ہمارے ان طالب علموں کو تربیت حاصل کرنے میں خاصی آسانی ہو گی جو صحافت کو پیشے کے طور پر اختیار کرنے کے متمنی ہیں۔ میں چاہوں گا کہ ہمارے وہ اساتذہ اور طلبہ جو اس طرح کے کورسز سے وابستہ ہیں وہ اس کتابچے کے بارے میں اپنی آراء سے ضرور نوازیں تاکہ اس کی دوسری اشاعت کی تیاری کے دوران ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا جا سکے۔

ظہور!

# ترتیب

# چھاپے خانے کی کہانی

جس طرح آگ کی دریافت نے انسانی تاریخ میں انقلاب انگیز تبدیلیوں کی راہ ہموار کی، اسی طرح چھاپے خانے کی ایجاد نے انسانی فکر کو ایسے پَر عطا کیے جنھوں نے نہ صرف انسان کے ذہنی ارتقا کو نئے آفاق سے ہم کنار کیا بلکہ معاشرے کی ترقی کے بھی نئے دروازے وا کیے۔ انسانی فکر و خیال اور عقل و دانش کے نہ جانے کتنے سرمائے سے اسے محض اس لیے ہاتھ دھونے پڑے کہ اسے محفوظ کرنے کے وسائل اسے میسر نہیں تھے۔ اگر اس فن سے وہ اُس وقت آشنا ہوتا کہ جب اسکندریہ کی عظیم لائبریری کو جولیس سیزر، پیٹرارک یا پھر مسلمانوں نے تباہ و برباد کیا تو شاید اس قدر نقصان نہ ہوا ہوتا جتنا ہر مسودے کی محض ایک ایک کاپی لائبریری میں ہونے کی وجہ سے ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق ان تین تباہ کاریوں کے دوران کم و بیش ٦ لاکھ مسودے نذرِ آتش ہوئے۔ ان ٦ لاکھ کتابوں کے ساتھ انسانی فکر و دانش کی کیسی کیسی موشگافیاں یا عقدہ کشائیاں بھی تلف ہوئیں، اس کا اندازہ آج لگانا شاید ممکن نہ ہو۔ قصہ یہ کہ اس ہنر سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے وقت اور زمانے نے انسان کے ہاتھوں سے کیسے کیسے جواہر پارے چھینے ہوں گے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس کلاسیکی دور کے ادب و فلسفے کا مطالعہ کیا ہے۔

آج اگر ان سے بڑی تباہیاں بھی ٹوٹ پڑیں لائبریریوں کی لائبریریاں کیوں نہ تلف کر دی جائیں پر انھیں پھر سے ترتیب دینا مشکل نہ ہو گا۔ کھوئی ہوئی کتب کو دوسری لائبریریوں سے حاصل کر کے از سرِ نو شائع کر کے تلافی کی جا سکتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں چھپنے والی کتاب دنوں میں ساری دنیا کی لائبریریوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کے ہمیشہ کے لیے کھو جانے کے خدشات کم ہو جاتے ہیں۔

انسان نے طباعت کا فن کس طرح سیکھا اور وہ ایجاد و اختراع کی کن کن منزلوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ اس میدان میں سب سے پہلی کوشش چینیوں کے

ہاتھوں ہوتی ہوئی ہمیں نظر آتی ہے۔ اس فن کا آغاز انھیں کے ہاں سے تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ وہ اپنی زبان کے حروف کو لکڑی پر کندہ کر کے انھیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ان پر سیاہی لگاتے اور پھر کاغذ کے تختوں پر دبا کر متذکرہ تحریر اُن پر منتقل کر دیتے۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔

چینیوں کے ہاں سے یہ فن چودھویں صدی میں کوریا پہنچا۔ ان کے ہاں چینیوں کے سرکنے والے حروف کی جگہ بلاک پرنٹنگ نے لے لی۔ یہ بلاک تصویروں سے بنائے جاتے تھے۔

یورپ میں یہ کام تاش کے پتوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے شروع کیا گیا۔ یہاں بھی طباعت کا آغاز تصویروں سے ہوا۔ کلیسا نے جب تاش کی بدعت کو پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کی مخالفت شروع کی تو اب کلیسا کے پادریوں، پوپوں، اور ولیوں کی تصویریں شائع کرنے کے لیے اس فن کو برتا جانے لگا۔

کاغذ عربوں کے ذریعے چین، جاپان سے اسپین بارھویں صدی میں پہنچ چکا تھا جہاں ایک پیپر مِل لگ چکی تھی۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ طباعت کے لیے کاغذ کی ضرورت کو بحسن وخوبی پورا کیا جاتا رہا۔

حرکت کرنے والے ٹائپ کی ایجاد کا سہرا لارنس کوسٹر (Laurens Coster) جو پیشے سے ایک سرائے کا مالک تھا، کے سر ہے جس نے حرکت کرنے والی ٹائپ سے ایک کتاب تیرھویں صدی عیسوی میں شائع کی۔ لیکن ابھی تک یہ فن مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے طباعت کو مکمل فن بنانے کا کام جرمنی کے ایک شخص جان گوتن برگ Johann Guten Berg نے انجام دیا۔ گوتن برگ ایک فارغ البال خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ۱۴۰۰ء سے کچھ عرصہ پہلے پیدا ہوا۔ جوانی کے دنوں میں یہ سٹراس برگ چلا گیا جہاں اس نے بلاک پرنٹنگ کا فن سیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ہیرے کو کاٹنے اور شیشے کو پالش کرنے کا کام بھی سیکھا۔ پھر ان دستکاریوں میں ایجادات کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح حروف کو جوڑ کر جملے بنانے کا فن اس نے ایجاد کیا۔ یہ ہر حرف کا ایک سانچہ بناتا جس میں دھات کے حروف بنانے کی کوشش کرتا۔ یہ ٹائپ کے حروف کی طرح ایک ہی حجم کے ہوا کرتے تھے۔ پھر انھیں جوڑ کر سطریں بنائی جاتیں اور صفحے ترتیب دیے جاتے۔ تاہم اب بھی یہ بڑا دقت کا کام تھا۔ اسی لیے وہ ایک سال کی سخت محنت کے بعد ۱۴۵۶ء میں انجیل کا ایک مخطوطہ شائع کرنے میں کامیاب ہوا۔

جرمنی کے بعد طباعت کے کام کی طرف توجہ دینے والے ممالک اٹلی اور فرانس تھے۔ لیکن ان ممالک میں بھی مطبع قائم کرنے کا کام جرمنوں نے ہی انجام دیا۔ اس کے فوراً بعد یہ کام انگلستان میں شروع ہوا۔ ولیم کیکسٹن (William Caxtion) نامی کنٹ کے ایک فرد نے کولون جاکر پریس کا کام سیکھا۔ اور واپس آکر ہومر کی شہرۂ آفاق تخلیق ایلیڈ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ یہ کام اس نے ۱۴۷۴ء میں انجام دیا۔ اس کے دو سال بعد اس نے ویسٹ منسٹر میں اپنا مطبع قائم کیا۔

کیکسٹن انگلستان کا پہلا ناشر تھا۔ پرنٹنگ کی ایجاد کو قرونِ وسطا کے خاتمے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس نے انسانی تصور کی بے پناہ قوتوں کو آزادی بخشی جس سے جہالت کا بھی خاتمہ ہوا۔ اس کی وجہ سے جرمنی میں مارٹن لوتھر کی اصلاحِ دین کی تحریک ممکن ہوئی۔

کتابیں، خبر نامے اور پھر اخبار نکلنا شروع ہوئے۔ تاہم گوتن کے بعد اشاعت کے طریقے تقریباً تین سو سال تک ایک سے رہے۔ ان میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ ہاتھ سے ہی حروف کو کمپوز کیا جاتا رہا اور انھیں ہاتھ سے چلائی جانے والی مشین سے ہی چھاپا جاتا۔۔۔ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے شوق نے اور پڑھنے کے لیے کتابوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے اس کام میں سرعت پیدا کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ چناں چہ اس ضرورت نے مزید ایجادات کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔

اٹھارویں صدی میں بھاپ سے چلنے والی پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے چھپائی کے کام میں بڑی سرعت پیدا کی۔

۱۸۲۲ء میں جرمنی کے دو اشخاص نے جو انگلستان میں مقیم تھے ایک ایسی پریس تیار کی جو ایک گھنٹے میں ۱۰۰۰ سے ۱۲۰۰ تک کاغذ کے بڑے تختے شائع کر سکتی تھی۔ ان اشخاص کے نام Friedrich konig اور اس کا مکینک Friedrich Bauer تھے۔

کونگ کے کارنامے کے ۵۰ سال بعد اس فن میں ایک اور اضافہ ہوا جسے روٹری پریس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی ایک مشین ایک امریکی ولیم بلاک william Bullock نے ۱۸۶۳ء میں تیار کی۔ یہی پریس آج اسٹنڈرڈ پریس تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں کاغذ کے بڑے بڑے رول مسلسل شائع کیے جاسکتے ہیں۔ لاکھوں کاپیاں ایک گھنٹے میں شائع کی جاسکتی ہیں۔ اس مشین میں کاغذ، سیاہی اور ٹائپ کا کام سلنڈروں پر ہوتا ہے۔ یہ

مشین کاٹنے اور کاغذ کو موڑنے کا کام بھی کرتی ہے اور ضرورت پڑنے پر کاپیوں کے بنڈل بھی تیار کر دیتی ہے۔ان پر صرف حروف ہی نہیں تصویریں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

۱۸۸۶ء میں ایک اور جرمن Mergen Thaler نے لینو ٹائپ (Lino Type) تیار کی۔ آفسیٹ پرنٹنگ جدید ایجاد ہے۔ حال ہی میں اس سے بھی بہتر ایک اور مشین نیویارک کی ایک کمپنی نے بنائی ہے جس کا نام Bell Tele Phone Laboratories Newyork ہے۔ اسے کمپیوٹر پرنٹنگ بھی کہتے ہیں۔

جرمن میں پرنٹنگ کا ایک اور طریقہ ۱۹۶۹ء میں ایجاد کیا گیا ہے۔ جسے Optical Digiset-Helloom کہتے ہیں۔ اب ایک اخبار بیک وقت مختلف شہروں سے شائع کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی ویژن کیمرے کے ذریعے متن کو نشر کیا جاتا ہے اور دوسرے شہروں میں اسے وصول کر کے شائع کر دیا جاتا ہے۔

# خبر بندی

اردو میں جس کے لیے "خبر" کا لفظ برتا جاتا ہے انگریزی میں اس کے لیے "نیوز" کی اصطلاح مستعمل ہے۔ قواعد کی رو سے انگریزی میں "نیوز" جمع ہے "نیو" کی لیکن جب اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر انگریزی میں استعمال کیا جاتا ہے تو وہ مفرد ہو جاتا ہے۔ یعنی "واحد" کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً جب انگریزی میں کسی شے کو "نیوز" قرار دیا جاتا ہے تو اس کے معنی ایک خبر کے ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے کاغذ کے ایسے تختے یا تختوں کے مجموعے کو جس پر بہت سی معلومات درج ہوں انگریزی میں "نیوز پیپر" اور اردو میں "اخبار" کہتے ہیں۔ یعنی خبروں کا مجموعہ۔ "خبر" کے معنی وہی ہیں جو انگریزی میں لفظ "نیو" کے ہیں۔ یعنی نئی چیز یا نئی اطلاع۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے خبروں کے مجموعے کو اخبار کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن جب اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر برتا جاتا ہے تو اس کے معنی قدرے مخصوص و محدود ہو جاتے ہیں۔ اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن کس طرح کی خبروں کا۔ خبریں تو ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن کا تعلق صدیوں پہلے ہوئے واقعات سے ہو۔ اس لحاظ سے تو تاریخ کی ساری کتب کو بھی اخبار کے زمرے میں ہی رکھنا پڑے گا۔ اور شاید دنیا کی ہر اس تحریر کو بھی جس کا تعلق انسانی زندگی کے کسی بھی دور سے ہو۔ میرا خیال ہے ہم اس اصطلاح کو اتنے وسیع معنوں میں استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے کسی نہ کسی حد تک تحدید ضروری ہے۔ اسی لیے اشفاق محمد خاں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "لغوی معنی میں خبروں کے مجموعے کا نام اخبار ہے لیکن دراصل کسی اخبار میں طبع شدہ تمام مواد خبروں پر مشتمل نہیں ہوتا۔ حقیقی خبروں (خبری مواد) سے مراد وہ اہم اطلاعات ہوتی ہیں جن کے پڑھنے کے لیے روزانہ صبح ایک قاری بے صبری سے اخبار کا انتظار کرتا ہے اور اس کو ان خبروں کے ذریعے ۲۴ گھنٹوں میں رونما ہونے والے دنیا

کے حالات، حادثات اور واقعات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس خبری مواد کا تعلق ملکی و غیر ملکی دونوں سے ہوتا ہے جن سے ہر قاری باخبر رہنے کی خواہش اور دل چسپی رکھتا ہے"۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے خبر کے جو لوازم سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

"۱- خبروں سے مراد وہ اہم اطلاعات ہیں جو پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران واقع ہونے والے حادثات و واقعات سے تعلق رکھتی ہوں۔

۲- ان کا تعلق ملکی و غیر ملکی واقعات سے ہوتا ہے"۔

اب آیئے کچھ اور تعریفوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ آیا خبر کی کچھ اور جہتیں تو ایسی نہیں ہیں جن کی طرف توجہ دی جانی چاہیے۔

"خبر ایک سچا واقعہ یا خیال ہے جس سے بڑی تعداد میں لوگوں کو دلچسپی ہو"۔

"کوئی بھی عصری واقعہ جو پڑھنے والوں کے ذاتی مسائل یا اس سوسائٹی سے تعلق کے حوالے سے ان کے لیے اہم اور دل چسپ ہو، خبر ہے۔ اور سب سے بہتر خبر وہ ہے جس میں دل چسپی اور اہمیت کے یہ عناصر زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ موجود ہوں"۔

"خبر ایک ایسے سچے عصری اور اہم واقعے کا صحیح اور معروضی و غیر جانب دارانہ مطبوعہ بیان ہے جو اخبار پڑھنے والوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہو"۔

"خبر ایک ایسی اطلاع ہے جس کو آپ گزشتہ کل تک نہیں جانتے تھے اگر وہ آپ کے علم میں اضافہ نہیں کرتی تو خبر نہیں ہے۔"

"اگر وہ کسی کی دل چسپی کا باعث نہیں ہے تو وہ خبر نہیں ہے۔ دوسری

---

۱- اشفاق محمد خاں۔ عوامی ذرائع ترسیل (ادارہ تصنیف۔ ڈی-۷، ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۹۸۲ء) ص ۱۵

طرف ایک بہت ہی دل چسپ افواہ بھی خبر کے دائرے میں نہیں آتی کیوں کہ وہ اہمیت سے خالی ہوتی ہے"۔

"خبر کا کسی نہ کسی واقعے سے ضرور تعلق ہوتا ہے"۔

"خبر کسی ایسے عصری واقعے، خیال یا صورتِ حال کا بیان ہے جو عوام کی دل چسپی کا باعث ہو"۔

"خبر کسی چیز کا انکشاف ہے"۔

"خبر ایک ایسی چیز ہے جسے کوئی دبا دینا چاہتا ہو"۔

"خبر اہم واقعات جس سے عوام کو دل چسپی ہو، کی پہلی رپورٹ ہے"۔

"خبر کسی حالیہ واقعے، خیال یا مسئلے کا بیان ہے جس سے عوام کو دلچسپی ہو"۔[1]

"خبر ایسی سب سے دل چسپ اہم اور صحیح اطلاع کا اندراج ہے جو ان اشیا کے بارے میں حاصل کی گئی ہو جنھیں انسان نے سوچا، کہا، دیکھا یا بیان کیا ہو یا ان کے بارے میں منصوبے تیار کیے یا کسی طرح کے عمل کا مظاہرہ کیا ہو"۔[2]

مندرجہ بالا ترجموں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خبر کے جو لوازم سامنے آتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱- خبر سے مراد وہ اہم اطلاع ہے جو پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران واقع ہوئے اور ان حادثات و واقعات سے تعلق رکھتی ہو جن کا تعلق انسانی کائنات سے ہے۔

۲- اس کا تعلق کسی ملکی یا غیر ملکی واقعے سے ہو۔

۳- تازہ ترین یا حالیہ واقعے سے تعلق رکھتی ہو۔ عصری انسانی مسائل کا محاکمہ کرتی ہو

---

1. Roland E. Wolseley (Ed), Journalism in Modern India. (Asia Publishing House: Bombay, 1964) P. 205.

2. Bostian, Casi and Baskilli, Editing The Day's News

اس کا تعلق کسی نئے واقعے سے ہو۔ کیوں کہ خبر جوں جوں باسی ہوتی جاتی ہے وہ اپنی طاقت سے محروم ہوتی جاتی ہے۔ وقتی اعتبار سے خبر کا تازہ سے تازہ ترین ہونا روزنامے کی ضرورتوں کا تقاضا ہے۔

۴- صداقت اور معروضیت خبر کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔ کسی واقعے یا واقعے کی تصویر کا متوازن بیان اس کی قدر و قیمت بڑھا دیتا ہے۔ یہاں مبالغے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے سے واقعے کی اثر پذیری میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ واقعہ بذاتِ خود تاثرات کا طوفان سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کے بیان میں کسی طرح کی رنگ آمیزی انٹی کلا ئمکس کا کام کرتی ہے جو خبر کی حرمت کو مجروح کردیتی ہے۔ اس لیے ایسی کوئی بھی کوشش یہاں سود مند نہیں ہو سکتی۔

۵- قارئین کے ارد گرد کے ماحول سے اس کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ خبر کا پڑھنے والے کے ماحول یا زندگی سے جتنا قریبی تعلق ہوگا خبر کا اثر اتنا ہی قوی ہوگا اور قارئین کی نظر میں اخبار کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ عوام اپنے واقعات و حادثات کو چاہے اس کی اہمیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، دور کے اہم سے اہم اور بڑے سے بڑے واقعات سے زیادہ اہم تصور کرتے ہیں اس لیے ایسے واقعات یا قریب کے واقعات کی خبری یا اخباری اہمیت بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔

۶- زبان کے اعتبار سے خبر کا عصری ہونا اتنا ہی اہم ہے جتنا مکان کے اعتبار سے مقامی ہونا۔

۷- خبر کا دل چسپ ہونا بھی ضروری ہے۔ خبر کی دل چسپی کا دارومدار بھی اس کی زمانی و مکانی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ عصری مسائل سے تعلق رکھنے والی خبر غیر عصری مسائل سے متعلق خبر سے زیادہ دل چسپ ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے ملک سے تعلق رکھنے والی خبر غیر ملکی خبر سے زیادہ باعثِ توجہ ہوتی ہے۔ اس کا نیا پن بھی دل چسپی کو بڑھاتا ہے۔ مثلاً کوئی ایسا واقعہ جو کبھی دیکھا یا سنا نہ ہو عام واقعات سے زیادہ دل چسپی کا باعث ہوتا ہے۔ خبر کا انتخاب کرتے وقت ان سب باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات کسی فرد کی اپنی غیر معمولی شخصیت بھی خبر کی دل چسپی کو بڑھا دیتی ہے یا کسی عام آدمی کی شخصیت کا کوئی ایسا پہلو جو غیر معمولی ہو خبر کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ زیادہ شدت بھی دل چسپی کو بڑھاتی ہے۔ مثلاً

کسی حادثے میں اگر مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے تو یہ پڑھنے والوں کی توجہ کو پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اسی طرح اگر واقعہ فطری نوعیت کا ہے جب بھی اس کا اثر زیادہ شدید ہوتا ہے۔ تجسس کے عناصر بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

اسی طرح قتل و غارت گری، جنگ، مفلسی، استحصال، آپسی منافقت، حسن و عشق، ایجادات، دریافتوں، آثار قدیمہ، طنز و مزاح، بچوں اور جانوروں کی کہانیاں اور مہماتی نوعیت رکھنے والی خبریں بھی خاصی دل چسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ جرائم، مذہبی واقعات، اقتصادی اور فطری تباہیاں اور المیہ حادثات، میاں بیوی کے جھگڑے، صحت، سائنس، تفریح طبع، تحقیقات، موسم خوراک اور اقلیتوں کے موضوعات بھی عوام کی دل چسپی سے تعلق رکھتے ہیں۔

خبر اور کہانی کے فن میں اگرچہ بڑا قریبی رشتہ ہے لیکن یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اس لیے خبر کی ترتیب و تشکیل کے دوران اخبار نویس یا نامہ نگار کو پھونک پھونک کر چلنا پڑتا ہے کیوں کہ اس کی ذرا سی غفلت اس کی ساری محنت پر پانی پھیر سکتی ہے۔ فنی اعتبار سے قربت کے باوجود خبر اور کہانی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خبر کا تعلق حقیقی واقعات و افراد سے ہوتا ہے جب کہ کہانی کا فرضی واقعات و کرداروں سے۔ خبر میں ایجاد و اختراع کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جب کہ کہانی کا زیادہ تر تعلق انھیں دو عناصر سے ہوتا ہے۔ واقعہ چاہے سچا بھی کیوں نہ ہو کہانی کار اسے پیش کرنے کے لیے ایجاد و اختراع کا سہارا لیتا ہے اور اس طرح زمانی و مکانی اعتبار سے ایک محدود معنوں میں سچائی کو غیر مکانی اور غیر زمانی یعنی آفاقی نوعیت عطا کرتا ہے۔ یہ مرکز گریز عمل ہے جب کہ خبر کی کہانی مرکز جو عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ (ادبی کہانی) واقعاتی و کرداری سچائیوں کو سارے مضمرات کے ساتھ بیان کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس (خبری کہانی) میں اخبار نویس، نامہ نگار یا صحافی کا کردار محض راوی کا ہوتا ہے جو اپنی آنکھ کو مصور کے قلم کی طرح نہیں کیمرے کے لینس کی طرح استعمال کرتا ہے۔

ان بنیادی اختلافات کے باوجود خبر کی تحریر کے دوران کہانی کے فن سے استفادہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نامہ نگار یا اخبار نویس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خبر کو کہانی کے طور پر رقم کرنے کے فن سے آشنا ہو۔ اگر وہ خبر کو کہانی بنانے کے باوجود اس کی صداقتوں کو برقرار رکھنے کا گر نہیں جانتا تو وہ نہ تو کامیاب صحافی / نامہ نگار / اخبار نویس بن سکتا ہے اور نہ اس فن کو اس کی معراج تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔

اس کے لیے سب سے پہلی بات جس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ خبر کی کہانی کا مقصد صرف وضاحت کرنا یا اس کی (قاری کی) معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ جب کہ ادبی کہانی کا مقصد تفریح فراہم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے جذبات کو متحرک کرنا اور غور و خوض کی ترغیب دینا ہوتا ہے۔ یہ وہی کام ہے جو سارے فنون لطیفہ انجام دیتے ہیں یعنی مسرت سے بصیرت تک لے جانا۔ خبری کہانی صرف معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ غور و خوض کی ترغیب بھی دے سکتی ہے لیکن یہ اس کا بنیادی نہیں ضمنی مقصد ہے۔ تاہم دونوں قسم کے کاموں کے بنیادی عناصر ترکیبی ایک ہی ہیں۔ لوگ اور عمل۔ ایک صحافی یا نامہ نگار اپنی کہانی کو اسی وقت تک کہانی کہہ سکتا ہے جب تک اسے اس کا احساس ہے کہ وہ جن لوگوں سے تعلق رکھتا ہے وہ حقیقی اور زندہ لوگ ہیں اور جن اعمال کو وہ پیش کر رہا ہے وہ ایسے اعمال ہیں جنھیں عدالت میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ خبر کی کہانی اور ادبی کہانی دونوں کا تعلق واقعے سے ہوتا ہے۔ واقعے کے بغیر نہ کوئی ادبی کہانی وجود میں آسکتی ہے اور نہ خبری کہانی...... واقعات کے سارے مضمرات کو جوڑ کر کہانی کا پلاٹ بنتا ہے۔ یہاں تک تو دونوں میں یکسانیت ہے لیکن اس سے آگے کا سفر دونوں مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے اپنے اپنے طور پر طے کرتی ہیں۔

ادبی کہانی کے فن کار کے پاس اپنی منزل تک پہنچنے کے مختلف راستے ہوتے ہیں۔ وہ کہانی کے واقعات کو ایک لیک پر نہیں چلاتا۔ اس کا مقصد چوں کہ مسرت سے بصیرت تک لے جانا ہوتا ہے اس لیے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور واقعات کی ترتیب و تشکیل کے معاملے میں بھی ایجاد و اختراع سے کام لیتا ہے۔ کبھی وہ کہانی کو انجام سے شروع کرتا ہے اور کبھی ابتدا سے لے کر اختتام تک ایک لیک پر چلتا رہتا ہے۔ کبھی وہ ماضی سے مستقبل تک سفر کرتا ہے اور کبھی مستقبل سے ماضی کی طرف فلیش بیک کی صورت میں سرکتا ہے۔ کبھی وہ بیک وقت تینوں زمانوں میں سفر کرتا نظر آتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی کسی ایک صیغے کو استعمال کرنا اس کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔ کبھی وہ ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو کبھی حال کا۔ کبھی وہ مستقبل کے صیغے کو برتتا ہے تو کبھی تینوں زمانوں میں بیک وقت سفر کرتا ہے۔ کبھی صیغہ حاضر متکلم میں بات کرتا ہے تو کبھی صیغۂ غائب میں۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ ادبی کہانی کے فن کار کے پاس ایک وسیع کائنات ہوتی ہے جس میں وہ عمل پیرا ہوتا ہے۔ خبری کہانی کار کے پاس ایک محدود دائرے کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھی اگرچہ تینوں زمانوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اس کے باوجود اس کا زیادہ تر تعلق ماضی سے ہوتا ہے یعنی ایسے

واقعات سے جو گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران رونما ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اگرچہ وہ عصری حقائق ہی کا درجہ رکھتے ہیں پر ماضی کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔

ادبی کہانی میں واقعات کی ترتیب کے وقت واقعاتی و تاثراتی ارتقا کا خاص خیال رکھا جاتا ہے یعنی اگر ایک طرف اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر آنے والا واقعہ اپنے سے پہلے واقعہ کی کوکھ سے ابھرتا ہوا نظر آئے اس کے ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر واقعہ اپنے سے پہلے کے واقعے سے زیادہ متاثر کرنے والا بھی ہو تاکہ تاثراتی اعتبار سے بھی کہانی آگے کی طرف مائل رہے۔ یعنی اس میں تاثر کی سمت ہمیشہ ارتقا کی طرف مائل رہتی ہے۔

خبری کہانی میں نہ تو واقعاتی ترتیب اس طرح سے ہوتی ہے نہ تاثراتی ارتقا---- یہاں واقعاتی اور تاثراتی طور پر سب سے قوی حصوں کو سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے اور کم اہم واقعات و تاثرات کو اس کے بعد----- مثلاً اگر خبر کا تعلق کسی ایسی تقریب سے ہے جس میں مختلف حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تو اس حقیقت کے باوجود کہ صدر جلسہ نے سب سے آخر میں تقریر کی ہوتی ہے اسے خبر میں سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے کیوں کہ سارے خطبات میں اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا خبری کہانی تشکیل دیتے وقت کہانی میں واقعات کی سمت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اہم واقعے کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد باقی واقعات کو ان کی اہمیت کے اعتبار سے رقم کیا جاتا ہے۔ یہاں ادبی کہانی کے پلاٹ کی طرح آغاز، درمیان اور اختتام کے اصولوں کو بھی ان کی منطقی ترتیب کی طرح نہیں برتا جاتا، نہ درمیان کو کلائمکس سمجھ کر اس کے بعد پیش کیے واقعات کے حل پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کہانی کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ قاری کو واقعے کے اہم پہلوؤں سے پوری طرح روشناس کر دیا جائے۔ واقعے کی تہہ میں برسرپیکار عناصر تک پہنچا کر ان اثرات کو سمجھنے میں مدد دی جائے جنھوں نے متذکرہ واقعے کو رونما کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اس کشمکش کی تصویر کشی نہیں کی جاتی جو آغاز و انجام کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے خبری کہانی کے عمل کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے:

۱- خبری کہانی میں اہم واقعات کو سب سے پہلے اور کم اہم واقعات کو بعد میں پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اہم ترین واقعے کو سب سے پہلے بیان کرنے کے بعد بقیہ واقعات کو اسی ترتیب سے پیش کر دیا جاتا ہے جس طرح وہ حقیقت میں واقع

ہوئے ہوں۔

۲- واقعے کو بے کم و کاست پیش کیا جاتا ہے۔

۳- زبان و بیان کی معروضیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھا جاتا ہے۔

۴- واقعے کی وجوہات اور انجام کو پوری تفصیلات سے پیش کر دیا جاتا ہے۔

۵- اشخاص اور جگہوں کے ناموں کو پوری سچائی کے ساتھ رقم کیا جاتا ہے۔

۶- عمل کے مطابق افعال کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی جتنا شدید واقعہ ہو، اُسی مناسبت سے افعال بھی برتے جاتے ہیں۔

۷- فعل معروف کے استعمال کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یعنی بجائے یہ لکھنے کے کہ "خط مجھ سے لکھا گیا"، "میں نے خط لکھا" لکھنا چاہیے۔

۸- اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ کہانی بنیادی طور پر حقیقت کو دھندلا کرنے کا عمل ہے۔ یعنی یہ حقائق کو تصورات میں بدلنے کا کام کرتی ہے جس کی خبر میں قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے کہانی کے صرف انھیں پہلوؤں کو خبر میں برتنا چاہیے جن سے حقائق کی حرمت باقی رہے۔

۹- ایک اچھی خبر وہی ہے جس میں اچھی کہانی کی بجائے حقائق کا اچھا بیان ہو۔ اور حقائق کے اچھے بیان کے معنی سادہ زبان میں واقعات کو بغیر خود دخل دیے آئینے کی طرح شفاف کر دینا ہے۔

۱۰- یہاں کسی بھی طرح کے مبالغے کی گنجائش نہیں، نہ ہی شدید جذبات کی نمائش کی ہی گنجائش ہوتی ہے۔

۱۱- ایجاز و اختصار اس کی جان ہے۔ یہاں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنا ہوتی ہے اس لیے اس میں غیر ضروری واقعات و تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

۱۲- خبر کا قاری نتائج کا متلاشی ہوتا ہے اس لیے خبر کی کہانی کو نتائج پر زیادہ زور دینا چاہیے بہ نسبت نتائج تک پہنچانے والے واقعات کو بیان کرنے کے۔

۱۳- خبری کہانی اسی لیے اُس ترتیب سے تشکیل نہیں پاتی جس ترتیب سے ادبی کہانی ترتیب پاتی ہے۔ نہ اس میں تاریخی ترتیب ہی ملحوظ رہتی ہے۔

۱۴- اس لیے خبر اکثر وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں ادبی کہانی ختم ہوتی ہے۔

۱۵- نہ ہی صحافی یا نامہ نگار کو کہانی کار کی طرح اظہار کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ کسی واقعے پر تبصرہ کر سکے یا واقعے کے مرکزی کردار کی روح میں اتر کر اس کے نفسیاتی محرکات کی نشاندہی کر سکے۔ جو بولا یا کہا جاتا ہے اسے لکھ دیتے ہیں اور اس طرف توجہ نہیں دیتے کہ کوئی کردار کیا سوچتا یا محسوس کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں ہمیشہ عمل کو ہی پیش کرنا ہوتا ہے بغیر اس کی وجوہات کو پوری تفصیلات سے پیش کرنے کے۔

۱۶- کہانی اکثر اپنے ہیرو کی فتح یا شکست پر ختم ہوتی ہے۔ خبر میں یہ اتنا آسان نہیں ہوتا کیوں کہ یہاں کہانی کی طرح ہیرو ہیروئن نہیں ہوتے اور نہ صحافی ادبی کہانی کے مصنف کی طرح جانب داری سے ہی کام لے سکتا ہے۔ دوسرے یہاں اس طرح سے جیت ہار نہیں ہوتی۔ بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا ہی ممکن نہیں ہوتا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ یہاں نامہ نگار یا صحافی کی کامیابی کا راز اس میں نہیں ہوتا کہ وہ اپنی خبر کو کسی منطقی انجام تک پہنچائے۔ بلکہ اس میں ہوتا ہے کہ واقعات کو پوری صداقت کے ساتھ ، جس حد تک کہ وہ اُس وقت اس کی گرفت میں ہو پیش کر دینے کے بعد کہانی کو چھوڑ دے۔

۱۷- ادبی کہانی بذاتِ خود اپنا انجام بھی ہوتی ہے جب کہ خبری کہانی، کہانی کی ہئیت کو محض ایک لبادے ایک سانچے کے طور پر برتتی ہے۔ اس سانچے میں کس قسم کے عناصر پیش کیے گئے ہیں اس سے کہانی کے سانچے کو سروکار نہیں ہوتا۔

۱۸- ادبی کہانی کی طرح چوں کہ خبری کہانی بھی قارئین کے لیے لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں بھی ان کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

خبر بندی کے بنیادی اصولوں سے بحث کرتے ہوئے اشفاق محمد خاں جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں انھیں بھی یہاں مختصراً پیش کر دینا بے جا نہ ہوگا:

''صحافت صرف واقعات و حادثات کا سیدھا سادا بیان نہیں ہے بلکہ

اُن واقعات کی تہہ میں پہنچ کر اس سے متعلق تمام تفصیلات مہیا کرنا اور سیاق و سباق کی روشنی میں بھرپور جائزہ لینا بھی صحافی کی ذمہ داری ہے...... کسی بھی خبر کو پڑھ کر ہم اس کا تجزیہ کریں تو ہمیں ہر خبر درج ذیل چھے سوالات یا ان میں سے چند سوالات پر مشتمل نظر آتی ہے۔ یعنی:

(۱) کیا؟ (۲) کس نے؟ (۳) کب؟ (۴) کہاں؟ (۵) کیوں؟

(۶) کیسے؟

پھر اس دلیل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس اصول کو ایک مثال کے ذریعہ یوں سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً دو پارٹیوں میں اچانک فساد ہونے کے باعث ۲۰ انسانوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع ملی۔ لہٰذا اطلاع پانے پر نامہ نگار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ خبر بندی کے اصولوں کی روشنی میں وہ معلوم کرے۔

۱- کیا حقیقتاً فساد ہوا ہے؟ What

۲- فساد کس نے کیا ہے؟ Who

۳- فساد کب ہوا؟ When

۴- فساد کہاں ہوا ہے؟ Where

۵- فساد کیوں ہوا؟ Why

۶- فساد کیسے ہوا ہے؟ How

اس طرح نامہ نگار جب تک ان سوالوں کے جوابات کی تصدیق نہیں کر لیتا ہے اس کی خبر کو معتبر نہیں سمجھا جا سکتا......

"نامہ نگار کو خبر لکھتے وقت کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اس میں اپنے ذاتی تاثرات کو قطعاً شامل نہیں کرنا چاہیے...... جس خبر میں نامہ نگار کی اپنی رائے یا تاثرات کا اظہار شامل ہو گا اسے خبر سے زیادہ اداریہ، مضمون یا تبصرہ سمجھا جائے گا"۔

جناب خواجہ عبدالخالق بھی خبر کی تعریف کرتے ہوئے انھیں پہلوؤں کی طرف توجہ دینا اخبار نویس کا اولین فرض تصور کرتے ہیں:

"میں یہاں خبر کی تعریف کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ مختلف نقطہ ہائے نظر سے "خبر" کی مختلف تعریفیں ہیں جن پر کوئی اتفاقِ رائے نہیں ہے پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ "خبر اس چیز کا حال ہے جو واقع ہوئی ہو"۔ اب ہر واقعہ کے پیش آتے ہی جو سوال فوراً ذہن میں آتے ہیں ان سوالوں کو چھ کاف کہا جا سکتا ہے۔(۱) کیا (۲) کون (۳) کب (۴) کہاں (۵) کیوں (۶) کیسے۔ خبر پہلے چار سوالوں کی تشفی کرتی ہے یعنی کیا، کون، کب اور کہاں اور کسی حد تک آخری دو سوالوں کی یعنی کیوں اور کیسے کی بھی۔ مثال کے طور پر واقعہ یہ ہے کہ زید چاندنی چوک میں موٹر سے ٹکرا کر مر گیا۔ اب خبر دہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ قاری کو بتائے کہ یہ واقعہ کہاں اور کب پیش آیا۔ نیز یہ کہ حادثہ کیوں اور کیسے پیش آیا یعنی آیا زید غلط جگہ پر سڑک پار کر رہا تھا یا یہ کہ موٹر کار کا ڈرائیور اندھا دھند گاڑی چلا رہا تھا۔ اگر کوئی خبر قاری کے ان چھے سوالوں کی تشفی کر دے تو خبر مکمل کہی جا سکتی ہے"۔[1]

ایک اچھی خبر کی پہچان وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں سارے پہلوؤں کو متوازن طریقے سے پیش کیا گیا ہوتا ہے۔ نہ کوئی پہلو چھوٹتا ہے اور نہ کسی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ صداقت اور اختصار بھی ان کی نظر میں ایک اچھی خبر کے بنیادی عناصر ہیں۔

خبر بندی کے تشکیلی عناصر ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"خبر بندی کے اصولوں میں ابتدائیہ بھی ایک اہم اصول ہے۔ ہر خبر کے پہلے یا پہلے دو پیراگرافوں میں پوری خبر کا نچوڑ ہوتا ہے جس میں چھے کاف سوالوں کے جوابات ہوتے ہیں۔ اخباری اصطلاح میں اس نچوڑ کو ابتدائی یا لیڈ (Lead) کہتے ہیں۔

ابتدائیہ پیراگراف کے بعد کے تمام پیراگراف میں خبر کی تفصیل

---

۱- خواجہ عبدالخالق۔ کالم نگاری۔ خصوصیت اور اہمیت، اردو صحافت۔ (اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷) ص ۲۱۷

درج کی جاتی ہے۔ مدیر کو خبر کے کسی حصے کو کاٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس خبر کے آخری پیراگرافوں کو قلم زد کر دیتا ہے اور اس طرح اصل خبر پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ ابتدائیہ میں کسی واقعہ کی اطلاع کا نچوڑ موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا نامہ نگار کو خبر بندی کے وقت اس بات کا بے حد خیال رکھنا چاہیے کہ خبر کا نچوڑ پہلے اور دوسرے پیراگراف میں ضرور آجائے۔ ابتدائیہ تیار کرنا نامہ نگار کے اہم کاموں میں سب سے اہم کام خیال کیا جاتا ہے۔ ابتدائیہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ چھے کافی سوالوں کے جوابات پہلے یا دوسرے پیراگرافوں میں ہی تحریر ہو جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پہلے پیراگراف میں سب ہی سوالات نہ آسکیں۔ ایسی صورت میں باقی سوالات تیسرے پیراگراف میں بھی دیے جا سکتے ہیں۔ ایک بات مزید ذہن نشین رکھنا چاہیے وہ یہ کہ ابتدائیہ زیادہ طویل نہ ہو اور جملے بھی پیچیدہ الفاظ میں نہ لکھے جائیں تاکہ قارئین کی دل چسپی میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے" [1]

خبر کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں:

۱- راست خبر۔ (straight News)

۲- توضیحی خبر۔ (Interpretative News)

راست خبر میں واقعات کو بے کم و کاست بیان کیا جاتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ اور معروضی انداز میں جو کچھ ہوا ہے پوری ایمان داری سے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی کہانی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتی۔ نہ غلط بیانی یا غلط حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ نہ تو نتائج نکالتی ہے نہ الزام تراشی کرتی یا حالات و واقعات کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتی ہے، نہ ہی کسی طرح کی خیال طرازیوں میں خود کو الجھاتی ہے۔

دوسری طرف توضیحی خبر حالات و واقعات کو بڑے گہرے انداز میں پیش کرتے ہوئے تصویر کے سارے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے، پس منظر پیش کرتی اور اُسے موزوں معنی پہنانے کی

---

۱- اشفاق محمد خاں۔ عوامی ذرائع ترسیل۔ ص ۱۶-۲۰۔

کوشش کرتی ہے تاکہ قاری اُس کو بہتر طور پر سمجھ کر اُس کی مناسب تحسین کو ممکن بناسکے۔

خبر کی مناسب ترتیب و تشکیل کے لیے مندرجہ ذیل اُمور کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے:

۱- خبر میں چھوٹے الفاظ، جملے اور پیرے استعمال کیجیے۔

۲- غیر ضروری صفات سے اجتناب کیجیے۔ کیوں کہ ان سے مبالغے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو خبر کی صحت کو مشکوک بنادیتی ہے۔ حقائق کو پروپیگنڈے کے عناصر سے الگ کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً سرکاری وسائل سے حاصل شدہ اطلاعات کو قبول کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

۳- خبر کو موضوعی بنادینے والے عناصر سے دور رکھیے۔

۴- ناموں کو پورے ہجوں کے ساتھ لکھیے۔ ایجاز واختصار سے کام نہ لیجیے۔

۵- ہفتے کے دنوں اور مہینوں اور سالوں کے ناموں کو بھی پورے ہجوں کے ساتھ لکھیے۔

۶- سنہ بھی پورا ہونا چاہیے ۱۹۹۴ء نہ کہ ۹۴ء اسی طرح مالی سال کے لیے ۹۵-۱۹۹۴ لکھنا بہتر ہے۔

۷- اوقات کا اندراج گھڑی کے مطابق کرنا چاہیے اور انگریزی کی طرح ایک بجے کو ۱۳ بجے یا رات کے ۱۲ بجے کو ۲۴ بجے نہیں لکھنا چاہیے۔ اردو میں عام چلن ہی بہتر ہے۔

۸- انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کو ہی برتنا بہتر ہے۔

۹- روپے کے لیے لاکھ اور کروڑ کی اصطلاحیں استعمال کرنا بہتر ہے نہ کہ ملین ٹریلین وغیرہ۔

۱۰- مختلف فرقوں، مذہبی مقامات، زیارتوں، پیغمبروں، دیوی دیوتاؤں کے ناموں کو بڑے اہتمام کے ساتھ لکھیے۔ ایسی اصطلاحیں اور القاب ضرور استعمال کیجیے جن سے ان کا ادب واحترام ظاہر ہوتا ہو۔

۱۱- جن وسائل سے خبر حاصل کی ہو اُن کا حوالہ مختصراً ضرور دیجیے۔

۱۲- موسم کی تفصیلات صحیح صحیح درج کیجیے۔

۱۳- صدیوں کے ناموں کو بھی مختصر کر کے نہیں لکھنا چاہیے۔ مثلاً پندرھویں صدی عیسوی کو ۱۵ ویں صدی عیسوی نہ لکھیے۔

۱۴- اوقاف کا استعمال ضروری ہے اس سلسلے میں جدید اوقاف کا استعمال کیجیے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے امید ہے قارئین کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ خبر بندی کا فن کن امور کا متقاضی ہوتا ہے اور ان کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے کن باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، نیز ایک مثالی خبر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

غور کیجئے کہ کیا گذشتہ صفحات میں انہیں نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱- خبروں سے مراد وہ اطلاعات ہیں جو پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران ہونے والے ملکی و غیر ملکی واقعات و حادثات سے تعلق رکھتی ہوں۔

۲- ان کا تعلق ایسے سچے واقعات سے ہوتا ہے، جن میں لوگ دل چسپی رکھتے ہوں۔

۳- سب سے بہتر خبر وہ ہوتی ہے، جس میں دل چسپی اور اہمیت کے زیادہ عناصر ہوں۔

۴- یہ کسی سچے عصری اور اہم واقعے کا صحیح و معروضی اور غیر جانب دار مطبوعہ بیان ہوتا ہے۔

۵- اگر وہ کسی کی دلچسپی کا باعث نہیں ہے تو وہ خبر نہیں ہے۔ دوسری طرف ایک بہت دلچسپ افواہ بھی خبر کے دائرے میں نہیں آتی۔ خبر میں مبالغے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۶- خبر کا پڑھنے والے کے ماحول یا زندگی سے جتنا قریبی تعلق ہوگا اس کا اثر اتنا قوی ہوگا۔

۷- زبان کے اعتبار سے بھی اس کا عصری ہونا اتنا ہی اہم ہے جتنا مکاں کے اعتبار سے مقامی ہونا۔

۸- تجسس کے عناصر خبر کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

۹- قتل و غارت گری، جنگ، مفلسی، استحصال، آپسی منافقت، حسن و عشق، ایجادات، دریافتیں، آثار قدیمہ، طنز و مزاح، بچوں اور جانوروں کی کہانیاں اور مہماتی نوعیت رکھنے والی خبریں بھی خاصی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ جرائم، مذہبی واقعات،

اقتصادی اور فطری تباہیاں اور المیہ حادثات، میاں بیوی کے جھگڑے، صحت، سائنس، تفریحِ طبع، تحقیقات، موسم، خوراک اور اقلیتوں کے موضوعات بھی عوام کی دلچسپی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۰- خبر اور کہانی کے فن میں قریبی رشتہ ہونے کے باوجود یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اس لیے خبر کی ترتیب و تشکیل کے دوران اخبار نویس یا نامہ نگار کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

۱۱- خبر کا تعلق حقیقی واقعات و افراد سے ہوتا ہے جب کہ کہانی کا فرضی واقعات و کرداروں سے۔

۱۲- خبر میں ایجاد و اختراع کی گنجائش نہیں جب کہ کہانی کا تعلق انہی دو سے ہوتا ہے۔

۱۳- اخبار نویس یا نامہ نگار یا صحافی کا کردار محض راوی کا ہوتا ہے، جو اپنی آنکھ کو مصور کے قلم کی طرح نہیں کیمرے کے لینس کی طرح استعمال کرتا ہے۔

۱۴- اس کے باوجود نامہ نگار یا اخبار نویس کے لیے کہانی کے فن سے آشنا ہونا ضروری ہے۔

۱۵- خبر کا مقصد قاری کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے جب کہ کہانی کا مقصد تفریح کے ساتھ ساتھ جذبات کو متحرک کرنا اور غور و خوض کی ترغیب دینا ہے۔

۱۶- خبر کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے کیوں کہ وہ اُن واقعات کو پیش کرتی ہے جو گزشتہ چوبیس گھنٹے کے دوران ہو چکے ہوتے ہیں یعنی گو وہ عصری حقائق ہی کا درجہ رکھتے ہیں پر ماضی کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔

۱۷- خبر لکھتے وقت اس کے سب سے قوی حصوں کو پہلے پیش کیا جاتا ہے اور کم اہم حصوں کو بعد میں مثلاً اگر کسی تمدنی تقریب کے بارے میں خبر لکھنا مقصود ہے تو اگرچہ صدر سب سے آخر میں خیالات کا اظہار کرتا ہے لیکن خبر میں اس کے خیالات کو سب سے پہلے لکھا جاتا ہے۔

۱۸- خبر تشکیل دیتے وقت واقعات کی سمت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اہم واقعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اہم ترین واقعے کو سب سے

پہلے بیان کرنے کے بعد بقیہ واقعات کو اُسی ترتیب سے پیش کردیا جاتا ہے جس طرح وہ حقیقت میں واقع ہوئے ہوں۔

۱۹- واقعے کو بے کم وکاست پیش کیا جاتا ہے۔

۲۰- زبان و بیان کی معروضیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھا جاتا ہے۔

۲۱- واقعہ کی وجوہات اور انجام کو پوری تفصیلات سے پیش کردیا جاتا ہے۔

۲۲- اشخاص اور جگہوں کے ناموں کو پوری سچائی سے لکھا جاتا ہے۔

۲۳- جتنا شدید واقعہ ہو اسی مناسبت سے افعال برتے جاتے ہیں۔

۲۴- فعل معروف کو برتا جاتا ہے یعنی ''خط مجھ سے لکھا گیا'' کی بجائے ''میں نے خط لکھا'' لکھا جاتا ہے۔

۲۵- ایک اچھی خبر میں حقائق کو بغیر دخل دیے آئینہ کی طرح شفاف کردیا جاتا ہے۔

۲۶- ایجاز و اختصار خبر کی جان ہوتے ہیں۔

۲۷- خبر میں نتائج پر زور دیا جاتا ہے۔

۲۸- نامہ نگار یا صحافی کی کامیابی کا راز اس میں نہیں ہے کہ وہ اپنی خبر کو کسی منطقی انجام تک پہنچائے بلکہ اس میں ہوتا ہے کہ واقعات کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کردے۔

۲۹- خبر بندی واقعات و حادثات کا سیدھا بیان نہیں ہے بلکہ واقعات کی تہہ میں پہنچ کر اس سے متعلق تمام تفصیلات مہیا کرنا اور سیاق وسباق کی روشنی میں بھرپور جائزہ لینا ہے۔

۳۰- نامہ نگار کو خبر لکھتے وقت کسی واقعے سے متاثر ہو کر اُس میں اپنے ذاتی تاثرات کو قطعاً شامل نہیں کرنا چاہیے۔

۳۱- خبر بندی کے اصولوں میں ابتدائیہ بھی ایک اہم اصول ہے۔ ہر خبر کے پہلے یا پہلے دو پیراگرافوں میں پوری خبر کا نچوڑ ہوتا ہے جس میں کاف (ک) سے بننے والے

چھے سوالات کے جوابات ہوتے ہیں اخباری اصطلاح میں اس نچوڑ کو ابتدائیہ یا لیڈ (Lead) کہتے ہیں۔ ابتدائیہ کے تمام پیراگراف میں خبر کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۳۲- خبر کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

1- راست خبر (Straight News)

2- توضیحی خبر (Interpretative News)

راست خبر میں واقعات کو بے کم وکاست بیان کیا جاتا ہے سیدھے سادے الفاظ اور معروضی انداز میں۔ نہ نتائج نکالے جاتے ہیں، نہ الزام تراشی کی جاتی ہے، نہ حالات و واقعات کے بارے میں اپنی رائے پیش کی جاتی ہے، نہ کسی طرح کی خیال طرازیوں میں الجھتی ہے۔

۳۳- توضیحی خبر حالات و واقعات کو بڑے گہرے انداز میں پیش کرتے ہوئے تصویر کے سارے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ پس منظر پیش کرتی ہے اسے موزوں معنے پہنانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ قاری اس کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔

۳۴- خبر میں چھوٹے الفاظ، جملے اور پیرے استعمال کیے جانے چاہئیں۔

۳۵- غیر ضروری صفات سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔

۳۶- خبر کو موضوعی بنا دینے والے عناصر سے اجتناب ضروری ہے۔

۳۷- ناموں کو پورے ہجوں کے ساتھ لکھنا چاہیے۔

۳۸- سنہ بھی پورا ہونا چاہیے ۱۹۹۴ء کو ۹۴ نہ لکھنا چاہیے اس طرح مالی سال کو ۹۵-۱۹۹۴ء لکھنا چاہیے۔

۳۹- اوقات کا استعمال گھڑی کے مطابق کرنا چاہیے نہ کہ ایک بجے کو ۱۳ بجے اور رات کے بارہ بجے کو ۲۴ بجے لکھنا چاہیے۔

۴۰- روپے کے لیے لاکھ اور کروڑ کی اصطلاحیں استعمال کرنا چاہئیں نہ کہ بلین اور ٹرلین۔

۴۱- مختلف مذہبوں، مذہبی مقامات یا زیارتوں، پیغمبروں، دیوی دیوتاؤں کے ناموں کو بڑا احترام سے لکھنا چاہیے۔

۴۲- جن وسائل سے خبر ملی ہو اُن کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔

۴۳- موسم کی تفصیلات صحیح صحیح درج کرنا چاہئیں۔

۴۴- صدیوں کے ناموں کو بھی مختصر کر کے نہ لکھنا چاہیے مثلاً پندرھویں صدی عیسوی کو ۱۵ویں صدی عیسوی نہ لکھا جائے۔

۴۵- جدید اوقاف استعمال کیے جانے ضروری ہیں۔

حصہ اوّل:

# راست خبر کے چند نمونے

1- اوپر دی گئی خصوصیات کی روشنی میں نیچے دیے اقتباسات کو خبروں کی شکل دی جارہی ہے تاکہ طالب علم عملی نمونے سے بھی اکتساب فیض کرسکیں:-

نمونہ ا

خبری مواد:- ۱۹ر اپریل ۲۰۰۲ء کی صبح ۱۰ بجے شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی کے سیمینار ہال میں ایک پر وقار تقریب منعقد کی گئی، جس کی صدارت جموں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جناب آر۔ آر شرما نے کی۔ جناب وید بھسین بھی اس موقعہ پر مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ تقریب کا آغاز صدر شعبۂ اردو کے استقبالیہ خطبے سے ہوا جس کے دوران موصوف نے نہ صرف مہمانوں کا پرتپاک استقبال کیا بلکہ تقریب کے اغراض و مقاصد پر بھی مختصراً روشنی ڈالی۔ استقبالیہ خطبے کے بعد جناب پروفیسر ظہور الدین ڈین فیکلٹی آف آرٹس جموں یونی ورسٹی نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو زبان و ادب کے عصری مسائل پر روشنی ڈالی اور اردو زبان کے طلبہ، اساتذہ اور خیر خواہوں کو مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے سرکاری اداروں کی طرف دیکھنا بند کردیں اور خود جو کچھ کرسکتے ہوں وہ کریں۔

کلیدی خطبے کے بعد جناب وید بھسین نے اپنے خصوصی خطبے میں اردو کے تئیں ریاستی سرکار کی سرد مہری کا کھل کر ذکر کرتے ہوئے اس پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے باوجود حکومت اس کے حقوق کا تحفظ کرنے کے بجائے انھیں مسلسل نظر انداز کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ ملک کی شاید ہی کوئی سرکار ایسی ہو جو اپنی سرکاری زبان سے اس طرح کھلواڑ کر رہی ہو۔ ایک طرح سے یہ اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرنا ہے۔

جناب پروفیسر آر۔ آر شرما، وائس چانسلر جموں یونی ورسٹی نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو زبان کی لسانی و جمالیاتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ایک ایسی زبان، جس کے خزانے میں جلال و جمال دونوں کا سرمایہ موجود ہو اور جس میں انسان کے نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذبات کے اظہار کی گنجائش ہو اسے نفرت کا کوئی طوفان نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اردو زبان اپنے بل بوتے پر زندہ ہے اور رہے گی۔ اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ حکومت اس کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ وہ خود اپنا تحفظ کرنا جانتی ہے اس لیے جو بھی اس کے قریب آتا ہے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر شہاب عنایت ملک نے سامعین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

## خبر کی تشکیل:

جموں ۱۹ر اپریل (خصوصی نامہ نگار) شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی کے سیمینار ہال میں گیارہ بجے صبح ''ریاست میں اردو زبان و ادب کی صورت حال'' سے متعلق ایک پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت جموں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جناب آر۔ آر شرما نے انجام دی۔ جناب وید بھسین چیئر مین کشمیر ٹائمز گروپ آف پبلی کیشنز نے مہمان خصوصی کے فرائض انجام دیے۔

پروفیسر آر۔ آر شرما نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو زبان کی لسانی و جمالیاتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بڑے پرزور انداز اور پورے یقین کے ساتھ اس بات کا اعادہ کیا کہ ایک ایسی زبان جس کے خزانے میں جلال و جمال کا بے پناہ سرمایہ موجود ہو اور جس میں نازک سے نازک انسانی جذبات اور پیچیدہ سے پیچیدہ انسانی مسائل کو پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کرنے کی گنجائش ہو اُسے نفرت و تعصب کا کوئی طوفان نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اردو زبان اپنے بل بوتے پر زندہ رہی ہے اور رہے گی اس لیے حکومت اگر اس کے تئیں اپنے فرائض پورے

کرنے سے کوتاہی کر رہی ہے تو اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ زبانیں حکومتوں کی وجہ سے زندہ نہیں رہتیں۔ حکومتیں زبانوں کی خدمت کر کے زندہ و جاوید ہوتی ہیں۔ اردو زبان اپنا تحفظ کرنا جانتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خود اس کے دشمن بھی جب اس کے قریب آتے ہیں تو وہ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

جناب وید بھسین نے بھی اپنے خصوصی خطبے میں اردو زبان کے تئیں ریاستی سرکار کی سرد مہری کا کھل کر ذکر کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ پورے ملک میں ریاستی حکومت شاید واحد سرکار ہے جو گذشتہ پچاس برس سے خود اپنے آئین کی خلاف ورزی کرتی چلی آرہی ہے اور اس نے سرکاری زبان کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو کبھی پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے حقوق کا تحفظ کرنے کے بجائے وہ انھیں مسلسل نظر انداز کرتی چلی آرہی ہے۔

اس سے قبل پروفیسر ظہور الدین نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو زبان کے عصری مسائل پر کھل کر روشنی ڈالی اور اردو کے خیر خواہوں کو مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان کی ترقی کے لیے سرکاری اداروں کی طرف دیکھنا بند کر دیں۔

تقریب کا آغاز صدرِ شعبۂ اردو کے استقبالیہ خطبے سے ہوا۔ جب کہ ڈاکٹر شہاب عنایت ملک نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

جموں کے معزز شہریوں کے علاوہ یونی ورسٹی کے اساتذہ، اسکالرس اور طلبا کی خاصی تعداد نے تقریب کو اپنی فعال شرکت سے کامیاب بنایا۔

## نمونہ نمبر (۲):

خبری مواد :- قارئینِ کرام کو یاد ہوگا کہ ۱۵/اپریل ۲۰۰۱ء کو فلم "بس اتنا سا خواب ہے" کے شوٹنگ کے دوران فلمی دنیا کی جانی مانی شخصیت امتیابھ بچن کے بیٹے ابھیشیک بچن کی طرف سے بلا اشتعال حملہ کرنے پر قریشی نے ایف۔ آئی۔ آر تھانے میں درج کرائی تھی جس کے نتیجے میں دہلی کی عدالت میں سال بھر سے مقدمہ چل رہا تھا۔ چناں چہ ۳/مئی ۲۰۰۲ء کو ابھیشیک بچن کے شکایت کنندہ سے سمجھوتہ ہو جانے کی وجہ سے عدالت نے اُس کو اِس مجرمانہ عمل کے کیس سے بری کر دیا۔ میٹروپولیٹن مجسٹریٹ جی۔ پی۔ سنگھ نے فیصلہ سناتے ہوئے اپنے حکم میں کہا کہ شکایت کنندہ نے درخواست دی ہے کہ انھوں نے ملزم کے ساتھ رضا کارانہ طور پر سمجھوتہ کر لیا ہے اس لیے عدالت مجرم کو بری کرتی ہے۔

## خبر کی تشکیل

نئی دہلی ۴ رمئی (یو۔این۔آئی) دہلی کی عدالت نے فلم ایکٹر اور امتیابھ بچن کے بیٹے ابھیشیک بچن کو شکایت کنندہ کے ساتھ سمجھوتہ ہوجانے کے بعد مجرمانہ حملہ کے کیس سے بری کردیا۔ میٹروپولیٹن مجسٹریٹ جی۔پی۔سنگھ نے اپنے حکم میں کہا کہ شکایت کنندہ نے درخواست دی ہے کہ انھوں نے ملزم سے رضاکارانہ طور پر سمجھوتہ کرلیا ہے۔اس لیے عدالت ملزم کو بری کرتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پندرہ اپریل ۲۰۰۱ء کو فلم "بس اتنا سا خواب ہے" کی شوٹنگ کے دوران ابھیشیک کی طرف سے بلا اشتعال حملہ کرنے پر قریشی نے ایف۔آئی۔آر درج کرائی تھی۔

## توضیحی خبر۔

### نمونہ نمبر ا۔

### گوجروں کا روایتی ڈھوکوں تک رسائی حاصل کرنا روبہ زوال

جموں ۷رمئی :- ایک زمانہ تھا جب وہ اپنی مٹی کی جھونپڑیوں کے دروازہ کھلے رکھ کر چین کی نیند سوتے تھے۔اب وہ کواڑوں کو بند کر کے بھی سو نہیں سکتے۔

راجوری اور پونچھ کے اضلاع میں گذشتہ دہے کی دہشت گردی کا منفی اثر گوجروں کے یا عوام کے ڈھوکوں اور چراگاہوں کی طرف جانے پر پڑا ہے۔ گرمیوں کے موسم کے آتے ہی لوگ اپنے مال مویشی کے لیے سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں ڈھوکوں اور پہاڑوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہوتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ اب مسلسل روبہ زوال ہے۔ یہ سالانہ مشق اگرچہ زیادہ تر گوجروں اور بکر والوں سے منسوب ہے لیکن اکثریت اور اقلیت کے دوسرے طبقے بھی اپنے مال مویشی کی خاطر اپنی چراگاہوں کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ پر یہ روایت اب بڑی تیزی سے معدوم ہوتی جارہی ہے۔

گذشتہ دہے کے دوران ڈھوکوں کی طرف جانے والے کنبوں کی تعداد میں مسلسل کمی کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ پہلے گانو کے گانو گرمیوں کے چار پانچ ماہ کے لیے خالی ہوجایا کرتے تھے کیوں کہ سبھی کنبے اپنے مال مویشی سمیت ڈھوکوں کی طرف منتقل ہوجایا کرتے تھے۔ یہ علاقے

پیدل چلنے والے لوگوں خصوصاً کھلاڑیوں کے لیے بھی جنت کا درجہ رکھتے رہے ہیں۔

ان چراگاہوں میں سبز پتوں، گھاس اور جلانے کی لکڑی تو وافر مقدار میں میسر رہتی ہی ہے لیکن درجۂ حرارت کے اعتبار سے بھی جون، جولائی کی جھلستی ہوئی گرمی میں یہاں کا درجۂ حرارت اکثر صفر سے بھی نیچے اترتا رہا ہے۔ گھنے جنگلوں کے بیچ میں لوگوں نے مٹی کی جھونپڑیاں تعمیر کر رکھی ہوتی ہیں جن میں بہ یک وقت ۱۰/۱۲ کنبے رہ سکتے ہیں۔ بوڑھے، نوجوان، بچے وخواتین روز شام کو ایک جگہ جمع ہوکر گیت گاتے یا گپ شپ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن اب یہ صورتِ حالات قطعی بدل گئی ہے۔ اگر دہشت گردی کا جلدی خاتمہ نہیں کیا گیا تو وہ چیز جو ماہرین سماجیات کے مطالعہ کے لیے اہم تصور کی جاتی ہے ماضی کی بات بن کے رہ جائے گی۔ اس نے اُن طبقوں کے لیے ایک نسلی (Ethnic) تمدنی خطرہ پیدا کردیا ہے جو اس روایت کو صدیوں سے زندہ رکھے ہوئے تھے۔

عورتوں اور نوجوانوں نے اب چراگاہوں کی طرف جانا بند کردیا ہے۔ وہ جو ڈھوکوں کی طرف جاتے تھے جب اُن سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ ان میں اب ۷۰ سے ۸۰ فیصد تک کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ اب صرف بوڑھے اس خطرے کو لے کر ادھر جاتے ہیں۔ کیوں کہ نوجوانوں کو دہشت گردوں اور حفاظتی عملے دونوں کی طرف سے زیادہ خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ایک ایسے حالات میں جب حفاظتی انتظامات کے ہوتے ہوئے قلعہ بند عمارتوں میں رہنے والے بھی محفوظ نہیں ہیں، ڈھوکوں میں بسنے والوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ محفوظ ہیں محض نادانی ہے۔ خصوصاً جب کہ اُن میں دروازہ بند کرنے کے لیے نہ تو چٹخنیاں ہوتی ہیں نہ زنجیریں۔ بالائی علاقوں میں حفاظتی عملے کے باقاعدہ انتظامات بھی نہیں ہوتے۔ اُدھر وہ خصوصی احکامات اور مقاصد کے تحت ہی جاتے ہیں۔ راجوری اور پونچھ اضلاع کے ان ڈھوکوں کے راستے سے ہی دہشت گرد اصل سرحد (لائن آف کنٹرول) کو پار کرکے وادی کشمیر کی طرف جاتے ہیں۔ ان ڈھوکوں میں دہشت گرد کھلے عام گھومتے ہیں۔ انھیں اسلحہ رکھنے اور چھپنے کے لیے کمین گاہوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ڈھوکوں میں حفاظتی عملے کی کوئی ٹکڑی مستقل قیام نہیں کرتی۔ خصوصی اطلاع ملنے پر ہی حفاظتی عملہ اُدھر جاتا ہے پر اس صورت میں بھی زیادہ پریشانی کا سامنا عام لوگوں کو ہی کرنا پڑتا ہے۔

لوگوں کے ڈھوکوں کی طرف نہ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دہشت گرد جونکوں کی طرح اُن کا خون چوستے ہیں۔ دہشت گرد اکثر کھانے پینے کی چیزیں ساتھ نہیں لاتے جو بھی راشن

عوام لے کر ڈھوکوں میں آتے ہیں وہ یہ کھا جاتے ہیں۔ اب اِن لوگوں نے زیادہ راشن ساتھ لے جانا بند کر دیا ہے۔ نوجوان راشن لے کر ہر ہفتے ڈھوک پہنچا آتے ہیں اور شام سے پہلے لوٹ آتے ہیں تاکہ دہشت گرد انھیں اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ جو لوگ مجبور ہو کر اُن کے ساتھ جاتے ہیں انھیں حفاظتی لوگوں کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ دہشت گرد خالی ہاتھ نہیں آتے ہیں۔ دادر کے ڈھوکوں میں قتلِ عام کے بعد وزیرِ اعلیٰ اور وزیرِ داخلہ ایل۔ کے اڈوانی نے اعلان کیا تھا کہ وہ ویلج ڈیفنس کمیٹیوں کی طرز پر ڈھوک ڈیفنس کمیٹیاں بنائیں گے لیکن اس پر عمل کرنا ابھی باقی ہے۔ اس سلسلے میں جب ڈی۔ آئی۔ جی راجوری شری ایس۔ ایس بجرال سے رابطہ قائم کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ انھیں ایسا کوئی حکم نہیں ملا ہے۔ تاہم انھوں نے یقین دلایا کہ جہاں کہیں بھی ڈھوکوں میں لوگ خطرہ محسوس کرتے ہیں وہاں حفاظتی دستے تعینات کیے جاتے ہیں۔

## حصہ دوم

### مشق کیجیے:

نیچے دیے گئے اقتباسات کو راست یا توضیحی خبروں کی شکل دیجیے۔

**ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی طرف سے فنِ ترجمہ نگاری کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار**

مورخہ ۱۰ رمئی ۲۰۰۲ء ڈین فیکلٹی آف آرٹس جموں یونی ورسٹی نے انجمن ترقی اردو ہند جموں شاخ کے اشتراک سے جموں یونی ورسٹی کے این وائرن منٹ بلاک کے سیمینار ہال میں فنِ ترجمہ نگاری کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا جس کا افتتاح جموں یونی ورسٹی کے ڈین اکیڈمک افیرس جناب پروفیسر اے۔ این سادھو نے مارچ ۲۰۰۱ء کو گیارہ بجے دن این وائرن منٹ بلاک کے سیمینار ہال میں انجام دیا۔ جناب وید بھسین چیئرمین کشمیر ٹائمز گروپ آف پبلیکشنز نے مہمانِ خصوصی کے فرائض انجام دیے۔ جناب پروفیسر محمد زماں آزردہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کشمیر یونی ورسٹی مہمان ذی وقار کے طور پر شریک ہوئے۔

سیمینار کا آغاز ڈاکٹر شہاب عنایت ملک کے خطبۂ استقبالیہ سے ہوا۔ پروفیسر ظہور الدین ڈین فیکلٹی آف آرٹس جموں یونی ورسٹی نے اپنے کلیدی خطبے میں دو روزہ قومی سیمینار کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں سے ایم۔ اے

اردو پروفیشنل کورس کو مزید تقویت ملے گی کیوں کہ متذکرہ کورس میں کمپیوٹر، صحافت اور تخلیقی ادب (نثر) کے علاوہ ترجمہ کاری کی تربیت دینا بھی مقصود ہے تاکہ اس کورس کو مکمل کرنے کے بعد نوجوان اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر روزگار پیدا کرسکیں اور انھیں کسی حکومت یا ادارے کے سامنے دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے خود کو گروی نہ رکھنا پڑے۔

جناب وید بھسین نے اپنے خصوصی خطبے میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا کہ ترجمہ کاری ایک اہم پیشہ ورانہ شعبہ ہے۔ ترجمہ نگاروں کی ضرورت آج کل ہر جگہ محسوس کی جاری ہے خصوصاً ابلاغ عامہ، سیکرٹریٹ اور صحافت کے شعبوں میں ان کی بہت زیادہ ضرورت ہے اس لیے اس کورس کی تکمیل کے بعد وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

مہمانِ ذی وقار جناب محمد زماں آزردہ نے ترجمے کی ضرورت پر سیر حاصل روشنی تو ڈالی ہی انھوں نے ترجمے کی مختلف قسموں کا بھی ذکر کیا اور اسے موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے ترجمہ کے تہذیبی انسلاکات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔

پروفیسر اے۔این سادھو، ڈین اکیڈمک افیئرس جموں یونی ورسٹی نے اپنے صدارتی خطبے میں جہاں سیمینار کی اہمیت کا ذکر کیا وہاں انھوں نے اس بات کو بھی قابل صد تحسین قرار دیا کہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے فیکلٹی کی سطح پر ایک سیمینار منعقد کر کے ایک نئی روایت کا آغاز کرتے ہوئے دوسری فیکلٹیز کے ڈینز کو بھی تحریک دی ہے کہ وہ بھی اس طرح کی سرگرمیاں انجام دیں۔ موصوف نے ترجمے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اقوام کے مابین افہام وتفہیم کے مرحلے طے کرنے میں ترجمے نے قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔ یہ زندگی کے ہر میدان میں آدان پردان کا ایک بڑا ذریعہ رہا ہے۔ علمی و ادبی سطح پر انسان نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اُن میں ترجمے کا بھی ایک خاص کردار رہا ہے۔ جس کو انسانی تہذیب کی تاریخ ہرگز فراموش نہیں کرسکتی۔ آخر میں انھوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ دو دن کے سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں سے ترجمے کی ترقی کے مزید امکانات روشن ہوں گے اور اس کے فروغ کی نئی راہیں کھلیں گی۔ آخر میں ڈاکٹر نصرت چودھری نے شکریہ کی تحریک پیش کی۔ ڈاکٹر شہاب عنایت نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

سیمینار کے افتتاحی جلسے میں یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، اسکالرس اور طلبہ کے علاوہ معزز شہریوں کی اچھی خاصی تعداد نے شرکت کی۔

# سرخیوں کے تقاضے

## اور اخبار کی تزئین

کسی بھی خبری کہانی کو کوئی عنوان دینا آسان مسئلہ نہیں ہے۔ خاص طور سے ان حالات میں کہ جب وقت کی تنگی کی وجہ سے صحافی کے لیے کسی کمپیوٹر کی طرح کام کرتے ہوئے فی الفور کوئی سُرخی فراہم کرنا نہایت ضروری ہو۔ یہ مسائل اُس وقت اور بھی پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب اخبار ہفت روزہ یا پندرہ روزہ جریدہ نہیں بلکہ روزنامہ ہو۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگایئے کہ اُن لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا جنھیں ہر روز اخبار کے دو دو شمارے شائع کرنا ہوتے ہیں۔ یہ درست کہ ایسے اخباروں میں کام کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے، پر جہاں تک سرخیاں ترتیب یا تشکیل دینے کا کام ہے، دیکھا گیا ہے کہ یہ کام اخبار میں ایک دو حضرات سے زیادہ لوگوں کے سپرد نہیں کیا جاتا۔ اکثر کے ہاں کوئی ایک آدھ سب اڈیٹر ہی یہ کام انجام دیتا نظر آتا ہے۔

خبر کو اگر اخبار کا جسم قرار دیا جائے تو سرخی کو اُس کا چہرہ قرار دینا چاہیے۔ جس طرح چہرے کو باطن کا عکس تصور کیا جاتا ہے اسی طرح سرخی کی صورت و سیرت یعنی اُس کی ہیئتی و موضوعاتی نوعیت یا تو قاری کو فوراً ہی گرفت میں لے لیتی ہے یا پھر متنفر کر کے اخبار کو جھٹک دینے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ انسانی چہرے کے اور سرخی کے نقوش میں فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ اوّل الذکر میں جہاں تبدیلی نہ کر سکنے کے باوجود تزئین کی جا سکتی ہے وہاں آخر الذکر میں تبدیلی اور تزئین دونوں کا دارومدار اخبار نویس کے احساسِ جمال پر ہوتا ہے۔ وہ کاتب یا کمپوزیٹر کی مدد سے اسے جتنا جلی یا خفی یا دل کش و جاذبِ نظر بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس کے پاس ایسا کرنے کے وسائل ہوں۔

سرخیاں اخبار اور اس کے مدیر یا صحافی دونوں کے مزاج کی عکاس ہوتی ہیں۔ ان کی ترتیب و تشکیل سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ اخبار اور صحافی دونوں کا مقصد قاری کو جذباتی جھٹکے دے کر سستی شہرت حاصل کرنا ہے یا معلومات میں اضافہ کر کے غور و فکر کی

ترغیب دینا ہے پہلی قسم کی چونکانے والی سرخیوں میں تاثر کی سمت کلائمکس سے انٹی کلائمکس یعنی عروج سے زوال کی طرف ہوتی ہے جسے قاری کبھی پسند نہیں کرتا جب کہ دوسری قسم کی سرخیوں میں تاثر بڑے متوازن طریقے سے آہستہ آہستہ کلائمکس کی طرف بڑھتا ہے۔

آج کے اس دور میں سرخیوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ آج سے کوئی ایک صدی قبل سرخیوں کو اتنی اہمیت نہ دی جاتی تھی اور نہ ان کی ترتیب و تزئین کی طرف ہی اتنی توجہ دی جاتی تھی جتنی آج دی جاتی ہے۔ آج کل سرخیوں کو زیادہ سے زیادہ دل کش و بصیرت افروز بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اُن کا ''جاندار، بے حد دل چسپ، عمیق، دل کش اور طباعتی طور پر جاذب نظر ہونا'' اہم تصور کیا جاتا ہے۔

ان ابتدائی مصروضات کے بعد اور اس حقیقت کے باوجود ہم سب جانتے ہیں کہ سرخی کیا ہوتی ہے۔ آیئے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ کیا اس کی کوئی ایسی تعریف کی جاسکتی ہے جسے کسی طالب علم کی تشفی کے لیے پیش کیا جاسکے۔ جناب سید اقبال قادری اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''سرخی کسی بھی خبری مضمون، خط، بیان، تبصرہ یا تحریر کا مختصر ترین اقتباس یا خلاصہ ہوتی ہے۔ کسی بھی مطالعاتی مواد کی نوعیت کا فوری علم حاصل کرنے کے لیے سرخی بے حد ضروری ہے۔ سرخی عموماً بڑے حروف میں دل کش ترین طرز پر لکھی یا چھاپی جاتی ہے۔ سرخی ایک واضح اشارہ ہوتی ہے۔ سرخی قلم کار اور قاری دونوں کی مدد گار ہے۔ عام کتابوں، درسی کتابوں، ناولوں، افسانوں، دینی کتابوں وغیرہ کی سرخیوں سے اخباری سرخیاں کافی مختلف، معنی خیز اور پُرکشش ہوتی ہیں'' [1]

مندرجہ بالا اقتباس سے سرخی کے جو لوازم سامنے آتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱- سرخی وہ مختصر ترین اقتباس ہے جو خبر کے عنوان کے طور پر اُس پر چپکایا جاتا ہے۔
۲- یہ اُس مواد کا خلاصہ ہوتی ہے، جو خبر کے بطن میں مذکور ہوتا ہے۔
۳- اس کا دل کش ہونا ضروری ہے تاکہ قاری کی توجہ کو فوراً اپنی طرف مرکوز کرسکے۔

---

۱- جناب سید اقبال قادری۔ رہبر اخبار نویسی۔ ص ۱۲۲۔

۴- اس کا معنی خیز اور پُر کشش ہونا بھی ضروری ہے۔

۵- اس کی نوعیت ناولوں اور درسی کتابوں، افسانوں، ڈراموں اور دینی کتابوں کی سرخیوں سے مختلف ہوتی ہے۔

سرخی کے لوازم سے بحث کرتے ہوئے جناب ایم. وی. کامتھ نے جن خصوصیات کو سرخی کی بنیادی شرط قرار دیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱- مناسب و موزوں ہونا۔

۲- کہانی بیان کرنا۔

۳- اخبار کے معیار سے مطابقت رکھنا۔

۴- محض لیبل نہ ہونا۔

۵- محفوظ ہونا۔

۶- ایسا نہ ہونا جس سے اخبار پر حرف آئے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرخی کی ترتیب کے لیے صحیح الفاظ یعنی ایسے الفاظ جو خبری کہانی کے لیے سب سے زیادہ مناسب و موزوں ہوں اُسے اپنے مقصد میں کامیابی دلا سکتے ہیں۔ سرخی کا مقصد قاری کی توجہ کو فوراً حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ مقصد دو طرح سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک یہ کہ اُسے خوب صورت ترین طریقے سے قلم بند کیا جائے یعنی کتابت اِس قدر دیدہ زیب ہو کہ قاری دیکھتا ہی رہ جائے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ معنویاتی اعتبار سے بھی موزوں ہو اور کم سے کم الفاظ کے استعمال سے خبری کہانی کی طرف اشارہ کر سکے۔ کم سے کم الفاظ، خوب صورت املا، اقتباس کی موزوں ترین ساخت یعنی الفاظ کی موزوں ترین ترتیب اور معنویاتی ہم آہنگی اس کو جاندار بنا سکتی ہے۔

سرخی کی ترتیب بھی اُسی طرح سے تخلیقی عمل کے مترادف ہے جس طرح ایک خیال کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا فن قرار دیا جاتا ہے۔ صحافت نے جیسے جیسے ارتقا کی مختلف منزلیں طے کی ہیں ویسے ہی ویسے سرخی کے فن میں بھی نئے نئے ہفت خوان سر کیے گئے ہیں۔

سرخی کی ترتیب کے وقت اِس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کاتب ہر لفظ کو واضح اور الگ الگ لکھے تاکہ قاری کو پڑھنے میں دقت نہ ہو۔ الفاظ کے درمیان مناسب فاصلہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ بعض اوقات کاتب سرخی کی تزئین کی خاطر اس کی کتابت کرتے ہوئے ایسے نقش و نگار بناتا ہے کہ اصل الفاظ ان میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یا الفاظ کو ایک دوسرے کے

اوپر اس طرح سے سوار کر دیتا ہے کہ قاری کو پڑھنے کے لیے کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قاری ایک نظر میں ساری دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ بسا اوقات وہ ساری خبر پڑھنے کی بجائے وقت کی تنگی کی وجہ سے محض سرخیاں پڑھ کر ہی کام چلا لیتا ہے۔ ان حالات میں اگر سرخی پڑھنے میں اُسے دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اخبار کو اُٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ چناں چہ اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ صرف اُتنے الفاظ ہی استعمال کیے جائیں جن کے لیے جگہ میسر ہو اختصار کے چکر میں کہیں یہ نہ ہو کہ معنی ہی خبط ہو جائیں یا سرخی کی ساخت قواعد کی رو سے مجروح ہو جائے۔

سرخی میں حال کا صیغہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ خبر چاہے کتنی ہی پرانی ہو یہ ظاہر نہ ہونا چاہیے کہ وہ باسی ہے۔ ایسا کرنے سے اُس کی دل کشی ختم ہو جاتی ہے۔

اس طرح فعل معروف (Active Voice) کا ہی استعمال کیا جانا چاہیے نہ کہ فعل مجہول (Passive Voice) کا --- زمانے کو ظاہر کرنے والے افعال سے بھی اجتناب بہتر ہوتا ہے۔ یعنی سرخی میں ہے، تھا یا ہوگا، کے الفاظ بشرطیکہ وہ کسی کا قول نہ ہو، برتنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سرخیوں کا واضح اور تخصیصی ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنی اُس میں کسی طرح کا ابہام نہ ہونا چاہیے۔ ابہام جہاں شاعری کے تاثر کو بدرجہا بڑھا دیتا ہے اور اس کے محاسن میں شمار ہوتا ہے صحافت میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی اور سرخی میں تو خاص طور سے اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔ اگر کسی مالی نقصان کا ذکر کرنا مقصود ہو تو یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ کتنا نقصان اور کیوں اور کیسے ہوا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُردو اور انگریزی کے اخباروں میں کبھی کبھی دو قسم کی سرخیاں ایک ساتھ استعمال کی جاتی ہیں۔ اردو میں جلی سرخی اوپر لگائی جاتی ہے اور خفی اُس کے نیچے۔ جب کہ انگریزی کے اخباروں میں کبھی خفی اوپر رہتی ہے اور کبھی جلی۔ انگریزی والے اس دوسری سرخی کے چکر سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور اُن میں اکہری سرخی کا رواج اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ اردو والوں کو بھی یہی راستہ اپنانا چاہیے۔ اس سے جگہ ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ دوہری سرخی کا نقصان یہ ہے کہ اُسے پڑھنے کے بعد خبر پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ساری کہانی تو سرخیوں میں ہی بیان ہو جاتی ہے۔ نیچے اس کی تکرار کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔

جس طرح انگریزی کے اخبار کے کسی صفحے پر ایک ہی قسم کے حروف کی سرخیاں نہیں ہونی چاہئیں اسی طرح اُردو اخبار کے کسی صفحے پر ساری سرخیاں ایک ہی قلم سے نہیں لکھی جانی چاہئیں۔ یعنی صفحے کی سب سے اہم سرخی کو سب سے جلی حروف میں رقم کرنا چاہیے اور کم اہم کو دوسرے قلم سے۔ اس سے اخبار کے صفحے میں خوشنما تنوع پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کی آنکھ کو اچھا لگتا ہے۔ اسی طرح کچھ سرخیوں کو خطِ نستعلیق میں اور کچھ کو خطِ شکستہ میں لکھنا بھی سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ انگریزی میں یہی کام Italics کے استعمال سے لیا جا سکتا ہے۔

مجھے سید اقبال قادری کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے کہ "اُردو اخبارات میں سرخی نویس کا کام دیگر زبانوں کے اخبارات سے نسبتاً سہل اور لچکدار ہے۔ انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی، مرہٹی الغرض ہر اُس اخبار میں جہاں ٹائپ کی طباعت ہوتی ہے سرخی جمانے کے لیے ٹائپ کے حجم کی وجہ سے کافی دقت ہوتی ہے۔ کبھی کبھار سب ایڈیٹر کی لکھی ہوئی سرخی ٹائپ کی تختی کی وجہ سے مجوزہ جگہ میں جمائی نہیں جا سکتی۔ جہاں تک کتابت کا معاملہ ہے وہاں کاتب صاحب ذرا سی توجہ سے سرخی کو تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ آسانی کے ساتھ جما سکتے ہیں۔ اس طرح اُردو اخبارات میں سرخی لکھتے وقت ذرا زیادہ ہی آزادی نصیب ہے"۔[1] --- میرا خیال ہے ٹائپ کی صورت میں سرخی لگانے کا کام قدرے آسان ہوتا ہے کیوں کہ اُس کے حروف کا حجم پہلے سے متعین ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ پہلے سے لگانا آسان ہوتا ہے کہ متعلقہ کالمہ کی سرخی میں کسی خاص قسم کے ٹائپ کے کتنے حروف یا پھر الفاظ سما سکتے ہیں۔ کتابت کی صورت میں چوں کہ سارا انحصار کاتب پر ہوتا ہے اس لیے یہاں زیادہ ہوشیاری سے کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحافی کو زیادہ توجہ سے کام کرنا پڑتا ہے۔ کاتب کو الفاظ چھوٹے بڑے کرنے کی زیادہ آزادی تو حاصل ہوتی ہے لیکن کسی مخصوص سرخی کو کتنا چھوٹا یا بڑا کرنا ہے اس کی آزادی نہ تو کاتب کو ہوتی ہے اور نہ صحافی کو --- خبر کی نوعیت و اہمیت اُس کی شکل و صورت ساتھ لے کر آتی ہے۔ اُسے جگہ کی تنگی کی وجہ سے غیر مناسب قلم سے تحریر کرنے سے نہ صرف اُس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے بلکہ اُس کی اہمیت بھی زائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ کاتب اپنے قلم سے زیادہ کرشمے دکھا سکتا ہے تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ سچ مچ ہی وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے اگر وہ سرخی کے الفاظ کو ایک دوسرے پر سوار کرتا ہے تو اُسے پڑھنے میں دقت پیدا ہو جانے سے اُس کی اہمیت ختم ہو سکتی ہے۔

---

۱- رہبر اخبار نویسی۔

کسی سرخی یا شہ سرخی کو زیادہ سے زیادہ دل کش بنانے کا ایک طریقہ کسی ایسی تصویر یا کارٹون کے ساتھ شائع کرنا ہے جو خبر کی کہانی سے نسبت رکھتا ہو۔ تصویر، کارٹون نہ صرف خبر کی تفہیم میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ اُسے زیادہ مؤثر بھی بنا دیتے ہیں۔ تصویر کے ساتھ ایک خوب صورت عنوان بھی اگر لگا ہو تو خبر کی کہانی دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ خبر کی کہانی کے لیے جس ٹائپ یا قلم کا استعمال کیا جائے اُس قلم سے تصویر یا کارٹون کا عنوان نہ لکھا جائے۔ کارٹون یا تصویر کا عنوان منفرد نظر آنا چاہیے۔

اگر ایک خبر کے لیے ایک سے زیادہ تصویریں استعمال کرنا مقصود ہوں تو ہر ایک کے ساتھ الگ الگ عنوان لگانا چاہیے تاکہ ہر تصویر کا موضوع صاف پتا چل جائے نہ یہ کہ سارے عنوانات کسی ایک جگہ ۱، ۲ اور ۳ کے اعداد لگا کر لکھے جائیں۔ اس سے قاری کو تصویر تک پہنچنے میں دقت ہوتی ہے۔ قاری کے جذبات کو صدمہ پہنچانے والی یا اُن کے جذبات کا استحصال کرنے والی تصویریں استعمال نہ کی جانی چاہئیں۔ خاص طور سے خون خرابے والی تصاویر سے قاری کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کے استعمال سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

اب یہاں پر یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اخبار کے مختلف صفحات پر لگنے والی سرخیوں کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور ان کا انحصار صفحے کی اپنی اہمیت پر ہوتا ہے۔ مثلاً اخبار کے کل صفحات میں پہلے صفحے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں انھیں خبروں کو شامل کیا جاتا ہے جو نہ صرف نوعیت کے اعتبار سے سب سے اہم ہوتی ہیں بلکہ جو ہر قسم کے قارئین کی دل چسپیوں کی تشفی کا بھی باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً قارئین کا ایک بھاری طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو سیاسی و ملکی حالات میں سب سے زیادہ دل چسپی لیتے ہیں۔ اور اخبار سامنے آتے ہی جن کی نگاہیں سب سے پہلے ایسی ہی خبروں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ قتل و غارت گری کی خبروں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ سب سے پہلے ایسی ہی سرخیوں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ چناں چہ اخبار نویس کا فرض ہے کہ وہ ہر نوعیت کی اہم خبروں کو پہلے صفحے پر جگہ دے اور اُن کی سرخیوں کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے ہی ترتیب و تشکیل بھی دے۔ تاہم اس کا خیال رہے کہ سرخیوں کی ہیئت کو ادلتے بدلتے رہیں۔ اُن کی ہیئت کو مستقل حیثیت عطا نہ کر دیں کیوں کہ اس طرح سرخیاں ٹائپ بن جاتی ہیں اور اُن کی ہیئتی تکرار کچھ مدت کے بعد قارئین کو تنفر کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ ہر سرخی کو شکل کے اعتبار سے ایک سا نہیں رہنے دینا چاہیے۔ یعنی ایک دن اُسے جس طرح تحریر کیا جائے دوسرے دن اُسے بدل دینا چاہیے۔ یہ تنوع قارئین کی دلچسپی

کو برقرار ہی نہیں رکھتا بلکہ سرخی کی دل کشی میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

سرخی کی ترتیب و تشکیل میں کچھ باتوں سے بچنا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب سید اقبال قادری فرماتے ہیں:

> "سرخیاں لکھتے وقت عمدہ ذوق کا مظاہرہ ضروری ہے۔ سرخی میں اعتراض، طنزیا پھبتی سے احتراز کرنا چاہیے۔ کسی بات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا صحافتی ہی نہیں بلکہ انسانی بددیانتی ہے۔ الفاظ جہاں اظہار کا بہترین اور موثر ترین ذریعہ ہیں وہاں خطرات کا پیش خیمہ (بھی) ہیں۔ سرخی میں کسی فرد یا ادارہ کی توہین کا امکان ہے۔ خصوصی طور پر بین الاقوامی خبروں کی سرخیاں تحریر کرتے وقت غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا بھی غفلت سے کسی بھی ملک سے تعلقات میں کشیدگی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ بین الاقوامی دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کا تقاضہ ہے کہ ہم اخباری سرخیوں کے ذریعے کسی ملک کے احساسات کو ٹھیس پہنچانے سے بچیں۔
>
> "جنگ کے زمانے میں سرخیاں کافی احتیاط اور ذمے داری سے لکھی جائیں۔ معمولی سے معمولی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جنگ کے دوران سخت قوانین نافذ رہتے ہیں اور ملک کے دفاع کی خاطر کسی بھی صحافی کو گرفتاری اور نظر بندی کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اس طرح فوجی معاہدوں اور دیگر بین الاقوامی یا بین الریاستی معاہدوں کی سرخیاں بھی کافی توجہ سے لکھنا چاہئیں۔ مزدوروں کی ہڑتال اور احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کی خبروں کی سرخیاں بھی محتاط ہوں۔ اشتعال انگیزی یا جانب داری سے پرہیز لازمی ہے......
>
> "سرخی میں عجیب اور اعجازی الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ مثلاً "عمدہ ترین"، "افضل ترین"، "عظیم بالشان"، "مشہور ترین"، "قدیم ترین"، "اہم ترین" جیسے فوقیت والے صیغوں سے احتراز کیا جائے--- "بہت بڑی"، "بہت قیمتی"، "بہت ضروری" جیسے الفاظ استعمال نہ ہوں۔ "بڑا حادثہ"، "بڑی چوری"، "بڑا قتل" جیسے فقرے سرخی کو واضح نہیں کرتے۔ جو شے سرخی نویس کو بڑی اہم محسوس ہو وہ ضروری نہیں کہ

لیے عظیم یا ضروری ہو۔

"جو خبر بالکل صحیح یا مستند نہیں ہے اور افواہوں پر مبنی ہے اُس کے ساتھ ایک علامتِ استفہامیہ یعنی سوالیہ نشان سرخی میں لگانا ضروری ہے" [1]

اب آخر میں سرخیوں کی چند ایسی اقسام کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے جنھیں اخباروں میں عام طور پر برتا جاتا ہے۔ ایک عام رائے کے مطابق انھیں مندرجہ ذیل چھے اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری دکھائی دیتا ہے کہ نیچے جن اقسام کا ذکر کیا جارہا ہے اُن کا زیادہ تر تعلق انگریزی اخباروں سے ہے۔ اردو اخباروں میں ان سبھی اقسام کی سرخیاں برتی نہیں جاتی ہیں۔

## یک سطری سرخی (Crossline) :

اخباروں میں استعمال ہونے والی سرخیوں میں یہ سب سے مقبول قسم ہے۔ یہ ایک ہی سطر پر مشتمل ہوتی ہے چاہے لمبائی کے اعتبار سے کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی ایک، دو، تین یا چار کالمی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کالموں کی تعداد سرخی کی لمبائی سے زیادہ ہو تو سرخی کو دونوں طرف برابر جگہ چھوڑ کر بیچ میں لگایا جاتا ہے ------ اس سرخی کی کتابت بہت آسان ہوتی ہے۔

## کئی سطری سرخی (Dropline) :

یہ ایک ایسی سرخی ہوتی ہے جسے کئی سطروں میں لکھا جاتا ہے۔ کم سے کم سطروں کی تعداد دو اور زیادہ سے زیادہ کی تعداد چار تک ہوتی ہے۔ زیادہ تر اخباروں میں اس سرخی کے لیے دو سے زیادہ سطریں استعمال نہیں کی جاتیں۔ دوسری سرخی لگاتے وقت اردو اخباروں میں دائیں طرف تھوڑی سی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ (انگریزی کے اخبار میں یہ جگہ بائیں طرف رہتی ہے)۔ نمونہ :

---------------

1- رہبر اخبار نویسی۔ ص، ۱۲۵-۱۲۶۔

## ابرام معکوس سرخی (Inverted Pyramid) :

اس سرخی کو اس طرح سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ اُلٹی تکون کی سی شکل بن جاتی ہے۔ اس کو الٹا اہرام بھی کہتے ہیں۔ اسے تحریر کرتے وقت ہر دوسری سطر پہلی سطر سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اس لیے اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر نئی سطر اس سے پہلے کی سطر کے درمیان یا مرکز میں لکھی جائے۔ نمونہ:

----------------
-------------
----------
-----
--

## معلق سرخی (Hanging Indention) :

اس سرخی میں پہلی سطر کافی لمبی ہوتی ہے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی سطروں میں کافی اور یکساں حاشیہ دیا جاتا ہے۔ آخری سطر جہاں ختم ہوتی ہے سرخی کو بھی اُس جگہ ختم کر دیا جاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ انھیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے باقی سطریں پہلی سطر سے لٹکی ہوئی ہوں۔ نمونہ:

---------------
---------------
---------------
---------------

## Flush Left

اس سرخی میں ہر دوسری سطر اپنی سے اگلی سطر سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اردو اخباروں میں یہ سرخی لگاتے وقت حاشیہ دائیں جانب اور انگریزی اخباروں میں بائیں جانب دیا رہتا ہے۔
نمونہ:

------------------
------------
------------------
------------------
-------------
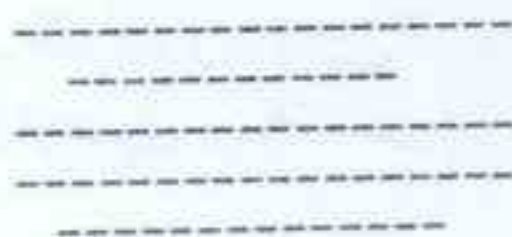
## مربع نما سرخی (Square Indention) :

یہ سرخی بھی تین چار سطری ہوتی ہے اور اسے لکھتے وقت دائیں جانب (انگریزی کے اخباروں میں بائیں جانب) دو تین سنٹی میٹر کا حاشیہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اخباروں میں اس طرح کی سرخی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اسے زیادہ تر رسائل میں برتا جاتا ہے۔

## اخبار کی تزئین:

سرخیوں کے ساتھ ہی ملتا جلتا کام اخبار کے صفحات کی تزئین ہے۔ اسے انگریزی زبان میں "میک اپ" کہا جاتا ہے۔ سرخی چاہے کتنی ہی مکمل اور خوب صورت کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے فنی تقاضے چاہے کتنے ہی احسن طریقے سے کیوں نہ انجام دیتی ہو اُس کے مقاصد اُس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک اُسے مناسب جگہ نہ ملے۔ انگریزی اخباروں میں تزئین کا کام کسی نائب مدیر کے ذمے ہوتا ہے۔ اردو اخباروں میں چوں کہ اتنا عملہ ہوتا ہی نہیں اس لیے یہ کام بھی زیادہ تر مدیر ہی کرتا ہے۔ بڑے اخباروں میں اس کام کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ وہاں اس کام کو کرنے والے نائب مدیر کو "میک اپ ایڈیٹر" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرخی کی حرمت کا دارومدار اُس کی مناسب تنصیب پر ہے۔ اگر اُسے مناسب جگہ پر نہیں لگایا جاتا تو نہ صرف اس کی اہمیت جاتی رہتی ہے بلکہ اُس کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ بے ترتیبی اخبار کے صفحے کا حلیہ بھی بگاڑ دیتی ہے جس کی وجہ سے قاری اُسے دیکھتے ہی نظریں پھیر لیتا ہے۔

اردو اخباروں میں یہ مسئلہ اس وجہ سے اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ وہاں سارا کام مختلف کاتبوں کے ذریعے کرایا جاتا ہے اور چوں کہ وقت کم ہوتا ہے اس لیے ایک ہی صفحے کی خبروں اور صفحے کو کئی کاتب بیک وقت لکھتے ہیں۔ چناں چہ کتابت کے فرق کی وجہ سے پورے صفحے کی شکل و صورت کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسے مختلف چہروں کے نقوش سے کوئی چہرہ ترتیب

دینے کی کوشش کی گئی ہو۔ بہتر یہ ہے کہ کم سے کم پہلے صفحے کو ایک یا دو کاتبوں سے ہی لکھوایا جائے۔ دوسرے صفحات میں اگر ایک سے زیادہ کاتبوں کے ہاتھ سے لکھی ہوئی سرخیاں اور خبریں بھی لگائی جائیں تو زیادہ فرق نہ پڑے گا۔ کم سے کم یہ تو کیا جاسکتا ہے۔ خبریں چاہے بہت سے کاتبوں نے لکھی ہوں اُن کی سرخیاں کسی ایک ہی کاتب سے لکھوائی جائیں۔ باہری صفحے کی سرخیاں ایک ہی کاتب لکھے۔

اردو اخبار کی مناسب تزئین کے لیے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ پہلے ہر صفحے کا ایک "خاکہ" جسے انگریزی میں ڈمی (Dummy) کہتے ہیں، تیار کیا جائے۔ کاتب اُس خاکے کو دیکھ کر کتابت کرتا چلا جائے۔ لیکن وقت چوں کہ بہت کم ہوتا ہے اس لیے اکثر ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح مختلف کاتبوں کی لکھی ہوئی سرخیوں یا خبروں کو جوڑنا بھی ایک دقت طلب کام ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک صفحے کے لیے ایک ہی کاتب مقرر کیا جائے۔ اس سے اس کی لکھی خبروں کو آسانی سے ترتیب دے کر جوڑا جاسکتا ہے۔

کچھ صفحات پر چوں کہ اشتہارات بھی لگانے ہوتے ہیں اس لیے ترتیب کے وقت تناسب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ نہ تو خبر کی اہمیت کم ہو اور نہ اشتہار کا مقصد فوت ہو۔

اخبار کی تزئین کے وقت اِس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جو چیز پہلی نظر میں ذہن و دل کو متاثر کرتی ہے اس کا اثر بھی بہت دیرپا ہوتا ہے۔

اخبار کی تزئین میں صفحے کا سائز بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اکثر اخبار جس سائز پر شائع ہوتے ہیں وہ برسوں کے تجربات کی دین ہے۔ اسے یونانیوں نے دریافت کیا تھا اور انگریزی میں اُسے گولڈن آبلانگ (Golden Oblong) کہتے ہیں۔ یعنی ہر فن کارانہ شے اگر پانچ مقدار لمبی ہو تو اُسے تین مقدار چوڑا بھی ہونا چاہیے۔

غور کیجیے کہ کیا گذشتہ صفحات میں انہیں نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱- خبر کو اگر اخبار کا جسم قرار دیا جائے تو سُرخی کو اس کا چہرہ قرار دینا چاہیے۔

۲- سرخیاں اخبار اور اس کے مدیر دونوں کے مزاج کی عکاس ہوتی ہیں۔

۳- سرخی کا جاندار، بے حد دل چسپ، عمیق، دل کش اور طباعتی طور پر جاذبِ نظر ہونا ضروری ہے۔

۴- سرخی وہ مختصر ترین اقتباس ہے، جو خبر کے عنوان کے طور پر اس پر چپکایا جاتا ہے۔

۵- یہ اس مواد کا خلاصہ ہوتا ہے، جو خبر کے بطن میں مذکور ہوتا ہے۔

۶- اس کا دل کش ہونا ضروری ہے تاکہ قاری کی توجہ کو فوراً اپنی طرف مرکوز کر سکے۔

۷- اس کا موزوں و مناسب ہونا بھی ضروری ہے۔

۸- دیدہ زیب ہونا اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

۹- کم سے کم الفاظ، خوب صورت املا، موزوں ترین ساخت اور معنویاتی ہم آہنگی وغیرہ عناصر اس کو جاندار بناتے ہیں۔

۱۰- الفاظ کی ترتیب میں فاصلہ رکھنا ضروری ہے تاکہ پڑھنے میں دقت نہ ہو۔

۱۱- سرخی میں حال کا صیغہ استعمال کیا جانا چاہیے۔

۱۲- فعل معروف (Active Voice) کا استعمال کرنا چاہیے نہ کہ فعل مجہول (Passive Voice) کا۔

۱۳- زمانے کو ظاہر کرنے کے لیے فعل کے استعمال سے اجتناب ضروری ہے۔ یعنی ''تھا

یا ہوگا'' کے الفاظ بشرطیکہ وہ کسی کا قول نہ ہو برتنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۱۴- سرخی میں ابہام نہ ہونا چاہیے۔

۱۵- اردو کے اخباروں میں جلی سرخی اوپر ہونی چاہیے اور خفی نیچے۔ انگریزی اخباروں میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔

۱۶- آج کل اکہری سرخی کو زیادہ پسند کیا جارہا ہے اردو والوں کو بھی یہی راستہ اپنانا چاہیے۔

۱۷- سارے صفحے پر سُرخیاں ایک ہی قلم سے نہیں لکھی جانی چاہئیں۔ اہم سرخی کو جلی قلم سے اور کم اہم کو خفی سے لکھنا چاہیے۔

۱۸- سرخی کو موثر بنانے کا ایک طریقہ اسے کسی تصویر کارٹون کے ساتھ شائع کرنا ہے، جو خبر کی کہانی سے مناسبت رکھتا ہو۔ تصویر یا کارٹون کا اگر کوئی خوب صورت عنوان بھی ہو تو خبر دو آتشہ ہو جاتی ہے۔

۱۹- اخبار کے مختلف صفحات پر لگنے والی سرخیوں کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا دارومدار صفحے کی اہمیت پر ہوتا ہے۔

۲۰- سرخی میں طنز یا پھبتی سے احتراز کرنا چاہیے۔

۲۱- کسی بات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا صحافتی بددیانتی متصور ہوتا ہے۔

۲۲- سرخی میں کسی فرد یا ادارے کی توہین نہ کرنا چاہیے۔

۲۳- اشتعال انگیزی یا جانب داری سے پرہیز ضروری ہے۔

۲۴- سرخی میں امتیازی الفاظ مثلاً عمدہ ترین۔ افضل ترین، قدیم ترین، مہتم بالشان جیسے الفاظ استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ بہت بڑی، بہت قیمتی، بہت ضروری جیسے صیغوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ بڑا حادثہ، بڑی چوری، بڑا قتل جیسے فقرے بات کو واضح نہیں کرتے۔

۲۵- جو خبر مستند یا صحیح نہ ہو اُس کی سرخی کے آخر میں سوالیہ نشان لگانا ضروری ہے۔

۲۶- سرخیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں مثلاً ایک سطری سرخی، کئی سطری سرخی، اہرام معکوس سرخی، معلق سرخی، مربع نما سرخی، لیکن ان کا زیادہ تر تعلق انگریزی اخباروں سے ہے۔ اردو میں زیادہ ایک سطری، دوسطری یا معلق سرخی ہی لگائی جاتی ہے۔

۲۷- معلق سرخی میں پہلی سطر کافی لمبی ہوتی ہے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی سطروں میں کافی اور یکساں حاشیہ دیا جاتا ہے۔ وضاحت کے لیے نیچے دی ہوئی سرخیوں کو دیکھیے۔

(۱) ایک سطری سرخی

| کشمیر میں بارودی سرنگ کے دھماکے سے بی ایس ایف کے ۶ جوان ہلاک |
|---|

(۲) دوسطری سرخی

| پٹرول و ڈیزل پر ایکسائز ڈیوٹی میں کمی متوقع |
|---|

| فیصلہ جسونت سنگھ کے واپس بھارت آنے پر۔ گاہکوں کو راحت دیں گے۔ (نائیک) |
|---|

(۳) معلق سرخی

| جموں و کشمیر میں ۴۱ فیصد، پولنگ، ہیرانگر میں ۸ بس مسافر ہلاک، بیسیوں مقامات پر ملے |
|---|

اننت ناگ اور پلوامہ اضلاع کے کئی پولنگ اسٹیشنوں پر ملی ٹینٹوں نے راکٹ اور دستی بم برسائے تشدد میں ۲۳ اشخاص ہلاک اور درجنوں زخمی۔ کئی مقامات پر ملی ٹینٹوں اور سیکورٹی فورسز میں خوں ریز تصادم ضلع کٹھوعہ میں ۵۹ فیصد، اودھم پور میں ۵۶ فیصد، پلوامہ میں ۲۸ اور اننت ناگ میں ۲۵ فیصد پولنگ ہوئی۔

## مشق

نیچے کچھ خبریں دی جارہی ہیں ان پر موثر سرخیاں لگائیے:

۱- نئی دہلی یکم اکتوبر (یو این آئی) کانگریس صدر شریمتی سونیا گاندھی نے آج عورتوں

سے کہا کہ وہ حقوق اور آئین کے تحت دی گئی مراعات کے لیے جدوجہد کریں۔ یہاں عورتوں کے حقوق سے متعلق آل انڈیا مہیلا کانگریس کی طرف سے بلائی گئی قومی کانگریس کا افتتاح کرتے ہوئے۔ مسز سونیا گاندھی نے ملک کے اندر عورتوں پر کیے گئے مظالم پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے عورتوں کے خلاف کئی جرائم جیسے جہیز، ستی اور مردوں کے مقابلے میں کم مشاہرہ دینے پر بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ شریمتی گاندھی نے کہا کہ عورتوں کو دیے گئے حقوق اور مراعات صرف کاغذ پر ہیں۔ ان ۱۴ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو جہاں کانگریس اقتدار میں ہے، شریمتی گاندھی نے کہا کہ وہ عورتوں کو دیے گئے حقوق سے متعلق قوانین کا نفاذ یقینی بنائیں۔ ملک میں عورتوں کی خراب حالت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے شریمتی گاندھی نے کہا کہ ناخواندگی کی وجہ سے عورتوں کو پتا ہی نہیں کہ انھیں آئین میں کیا کیا حقوق دیے گئے ہیں۔ اس لیے انھیں یہ بتانے کے لیے ایک مہم چلانی ہوگی کہ انھیں کیا کیا حقوق دیے گئے ہیں۔ دلّی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے بھی کانفرنس میں شرکت کرنے والے ڈیلی گیٹوں پر اس بات کے لیے زور دیا کہ عورتوں کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کہ ان مظالم کا چکر ختم ہونا چاہیے وہ آگے بڑھ کر کام کریں۔ اترا کھنڈ کے وزیر اعلیٰ نارائن دت تیواری اور کانگریس کے بہت سے سینئر لیڈروں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی۔

۲- جموں یکم اکتوبر (نامہ نگار) بارودی سرنگ کا بروقت پتا لگنے سے مکھیہ منتری ڈاکٹر فاروق عبداللہ بال بال بچے۔ تاہم دھماکے میں سیکورٹی فورسز کا ایک جوان ہلاک اور چار زخمی ہوگئے۔ یہاں پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر فاروق ایک چناؤ ریلی کو خطاب کرنے کے لیے ضلع ڈوڈہ میں بھاگوا جا رہے تھے لیکن بھاگوا میں ہیلی پیڈ علاقے میں پوری کھوج کے دوران ایک دھماکہ ہوا، جس سے ایک جوان ہلاک اور دو زخمی ہوگئے۔ اس علاقے میں تین دھماکے ہوئے جن میں پولیس کا ایک ڈرائیور اور ایس پی او زخمی ہوگئے۔ مکھیہ منتری نے علاقے کے دورے کا پروگرام ملتوی کردیا ہے۔

۳- فیئر فیلڈ (امریکہ) یکم اکتوبر (رائٹر) پاکستان کی سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے، جنھیں ۱۰ر اکتوبر کے انتخاب میں حصہ لینے سے روک دیا گیا ہے پاکستان کے سیاسی عمل کی مذمت کرتے ہوئے امریکہ سے اپیل کی ہے کہ وہ ان کے ملک میں جمہوری حکومت کی تشکیل کے لیے کام کرے۔

بیگم بھٹو کو جو گزشتہ تین سال سے اپنی مرضی سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہیں، انتخاب میں حصہ لینے سے روک دیا گیا ہے اور جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے دھمکی دی ہے کہ اگر انھوں نے پاکستان واپس آنے کی کوشش کی تو انھیں گرفتار کیا جائے گا۔ کنکٹی کٹ کی فیئر فیلڈ یونی ورسٹی میں کل تقریر کرتے ہوئے محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ فوجی حکومت نے خاص ڈر سے، انھیں میدان سے باہر رکھنے کے لیے قوانین تیار کیے ہیں۔ امریکہ سے انھوں نے اپیل کی ہے کہ وہ اس ملک میں آزادانہ انتخابات کے لیے دباؤ ڈالے جو دہشت گردی کے خلاف اس کی جنگ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ بیگم بھٹو نے کہا امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ یہ انتخابات شفاف ہوں اور تمام پارٹیوں و امیدواروں کو حصہ لینے کی اجازت حاصل ہو۔

۴- سرینگر ۱۶ر ستمبر (پی ٹی آئی۔ یو این آئی۔ نامہ نگار) جموں و کشمیر اسمبلی کے پہلے دور کی پولنگ میں ۲۳ حلقوں میں آج پاکستان کی طرف سے کنٹرول لائن پر زبردست گولہ باری، ملی ٹینٹوں کی طرف سے حملوں اور سیکورٹی فورسز کے ساتھ تصادموں کے ساتھ مکمل ہوئی اور تشدد کے باوجود ۴۴ فیصد پولنگ ہوئی۔ پولنگ مکمل ہونے کے بعد الیکشن کمیشن نے بتایا کہ آج ۱۴.۸۹ لاکھ ووٹروں میں سے ۴۴ فیصد ووٹروں نے اپنے ووٹ کا حق استعمال کیا اور مختلف جگہوں پر چناؤ کے دوران تشدد میں ۳ افراد ہلاک ہوئے۔

بارہ مولہ کے اوڑی حلقہ میں جہاں وزیر تعلیم محمد شفیع کا تکونہ مقابلہ ہے ۴۷ فیصد ووٹ پڑے۔ جب کہ اسی ضلع میں سوپور میں صرف پانچ فیصد ووٹ پول ہوئے۔ جہاں سے اسمبلی کے اسپیکر عبدل احد وکیل چناؤ لڑ رہے ہیں۔ ضلع راجوری میں نوشہرہ میں ۴۵ فیصد ووٹ پڑے۔ کرگل کے حلقوں میں ۳۵ فیصد ووٹ پڑے اور

وہاں عورتوں کے لیے ریزرو چند بوتھوں پر کافی تعداد میں عورتیں ووٹ ڈالنے آئیں۔ ملی ٹینٹوں کی طرف سے ووٹ نہ ڈالنے کی دھمکیوں کے باوجود سرحدی علاقہ گریز میں پہلے ساڑھے چار گھنٹے میں ۲۵ فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ کرگل میں بھی ووٹ تیزی سے پڑے۔ ملی ٹینٹوں کی دھمکیوں اور حریت کے بائیکاٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ۲۳ حلقوں میں اندازاً تیں فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ جموں کے خطہ پونچھ اور راجوری اضلاع میں ووٹ ڈالنے کی رفتار تیز رہی جب کہ وادی میں کپواڑہ اور بارہمولہ اضلاع میں ووٹنگ کم ہوئی۔ گیارہ گھنٹے کے پولنگ کے دوران جو چار بجے شام ختم ہوئی۔ ملی ٹینٹوں نے پولنگ بوتھوں پر حملے کیے جن میں ایک درجن لوگ زخمی ہوئے۔ ملی ٹینٹوں نے کئی پولنگ بوتھوں پر بارودی سرنگیں بچھا کر پولنگ میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نقصان سے پہلے انھیں بے اثر بنا دیا گیا۔ فوجی ترجمان نے بتایا ہے کہ پاکستانی فوجوں نے کل رات سے گولہ باری شروع کر رکھی تھی جو آج صبح تک جاری رہی۔

# اداریے کی ترتیب و تشکیل

کہیں پہلے یہ بات کہی جاچکی ہے کہ خبر کی دو قسمیں ہوتی ہیں یعنی راست خبر اور توضیحی خبر۔ اداریے کو توضیحی خبر کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگ تو اسے اخبار کا آئینہ اور اس کا ضمیر بھی قرار دیتے ہیں۔ الفاظ چاہے کوئی بھی استعمال کیے جائیں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اداریہ اخبار کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتا ہے۔ یہ اپنے ادارے کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کا علامیہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی نظریات واعتقادات کا ضامن بھی ہوتا ہے۔ قوم و ملک کے افق پر نمودار ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں ہی یہ اپنے نظریات وخیالات کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ یہ انھیں کون سی سمت میں بڑھتے ہوئے دیکھنے کا خواہاں ہے اس کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ اسی کے کالمز سے پڑھنے والوں کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنا آزاد و خود مختار اور بالیدہ وباشعور ہے۔ یا پھر کس کا حواری ودُم چھلا ہے۔ اسی میں کسی تصور، نظریے یا پالیسی کی تائید وتردید کی جاتی ہے یا عوام کی مناسب فکری رہنمائی کر کے انھیں کچھ حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ نئے آفاق کو مسخر کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، نئی رفعتوں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ عطا کیا جاتا ہے..........؟

> "اداریہ کا چست، منطقی، مدلل اور خوش اسلوب ہونا ضروری ہے۔ اداریہ پڑھ کر ہر قاری یہ محسوس کرے کہ کسی بھی معاملہ کی صحیح نوعیت اُس کے علم میں آگئی ہے۔ اداریہ روز مرہ پیش آنے والے واقعات پر روشنی ڈالنے والی ایک مشعل ہے۔ اداریہ عام قاری سے زیادہ ایسے قاری کو ذہن میں رکھ کر تحریر کیا جاتا ہے جو حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اور ہر مسئلہ کے گرد و پیش سے واقفیت حاصل کرنے کی دل میں خواہش رکھتا ہے۔ اداریہ نگاری کے لیے دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اداریہ بیٹھے بٹھائے کسی کاغذ پر

گھسیٹ نہیں دیا جاتا۔ اداریہ غور و فکر کے بعد، پوری ذمہ داری اور اس احساس کے ساتھ قلمبند کیا جاتا ہے کہ اداریہ میں عصری حالات کے رُخ کو موڑنے کی مخفی اور بے پناہ قوت موجود ہے۔ اداریہ ایک آئینہ ہی نہیں بلکہ ایک تیز ہتھیار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ اخبارات کے اداریوں کی وجہ سے کئی سلطنتیں تہ و بالا ہوئی ہیں۔ کئی وزارتوں کو مستعفی ہونا پڑا ہے۔ اداریہ نگاروں نے کئی مشاہیر کی قسمتیں بنائی ہیں اور بگاڑی بھی۔ اداریہ ایک حد درجہ طاقت ور وسیلہ ہے جس سے تقدیریں سنورتی بھی ہیں اور بگڑتی بھی ہیں۔ اداریوں کے ذریعہ تہذیب و تمدن کے کئی شعبوں میں انقلاب لایا گیا ہے۔ اداریہ ایک معلوماتی، حقائق سے پُر، رہنما خطبہ ہوتا ہے جو غائبانہ ہزاروں سامعین کو سنایا جاتا ہے[1]"۔

اداریہ تحریر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ جب تک اداریہ نگار اپنے خیالات و نظریات سے بے لاگ وفاداری کا ثبوت نہیں دیتا یا وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اس پر اتنا ہی یقین نہیں رکھتا جتنا یقین اُسے اپنے وجود پر ہے تو وہ اداریے میں وہ رُوح پھونک نہیں سکتا جو قوموں میں انقلاب پیدا کر کے انھیں نئی منزلوں کی طرف بڑھنے یا نئی رفعتوں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

جب تک اخباروں کی کائنات محدود ہوا کرتی تھی تو اخبار کا سارا کام یعنی خبریں جمع کرنے سے اداریہ لکھنے تک کا سارا کام اخبار کے مالک خود کیا کرتے تھے بسا اوقات کتابت کے فرائض بھی خود ہی انجام دیتے تھے۔ جب سے اخبار نویسی ایک انڈسٹری کا درجہ حاصل کر گئی ہے اور اسے بھی دوسرے پیشوں کی طرح بڑے بڑے اداروں میں تشکیل دینے کا کام کیا گیا ہے وہی کام جو پہلے ایک ہی شخص کیا کرتا تھا اب مختلف لوگ کرنے لگے ہیں۔ یہی نہیں ایک ہی کام کو مختلف اوقات میں مختلف لوگ کرنے لگے ہیں۔ اداریے کی ذمّے داریاں بھی مختلف اوقات میں مختلف لوگ انجام دینے لگے ہیں۔ اس صورتِ حال میں اداریہ لکھنے والے کی ذمّے داریاں قدرے اور بڑھ جاتی ہیں۔ اُس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اداریہ تحریر کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لے کہ اخبار کی پالیسی کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں وہ جو رویہ اختیار کر رہا ہے یا جن دلائل کو پیش کر رہا ہے وہ اخبار کی پالیسی کے منافی ہیں۔

---

[1] سید اقبال قادری۔ رہبر اخبار نویسی۔ ص ۲۹۵۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ادارتی بورڈ کا کوئی رُکن جسے اداریہ لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اُس پالیسی کو پسند ہی نہیں کرتا جن کی ترویج اخبار کر رہا ہے۔ ان حالات میں وہ روزی روٹی کی وجہ سے اداریہ تو لکھ دیتا ہے پر اُس کا یہ اداریہ اُس روح سے عاری ہوتا ہے جس کا اُس سے تقاضا کیا جاتا ہے۔ اُس کی وفاداریاں چوں کہ کسی اور نظریۂ حیات کے لیے وقف ہوتی ہیں اس لیے اُس کے دلائل میں وہ جان ہی نہیں ہوتی جو اُس صورت میں ہوتی اگر اُسے اس پالیسی پر اعتماد ہوتا۔ اس صورت میں وہ جو کچھ لکھتا وہ اُس کی روح کی گہرائیوں سے نکلتا اور بات دل سے نکل کر دلوں میں اُتر جاتی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک نوجوان اداریہ نگار کو یہ بات بھی ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ ہر موضوع جس پر وہ لکھ رہا ہے اخبار کی پالیسی سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ موضوع جس پر کسی کو اداریہ لکھنے کے لیے کہا جائے اخبار کی پالیسی سے تعلق رکھتا ہو۔ اُس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ہر موضوع کو پالیسی سے منسلک کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسا کرنے سے ہر موضوع مسئلہ بن سکتا ہے جو اخبار کے لیے مجموعی اعتبار سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ ایسا اخبار جلد ہی اپنے لیے غیر ضروری مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔

یہ بات البتہ یاد رکھنا اداریہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوع سے متعلق جو دلائل پیش کرے اُن کے مخالف دلائل کو بھی رد کرتا چلا جائے تاہم ایسا کرتے ہوئے اُس کے لب و لہجے میں شائستگی کا ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کی کوئی بات طنز کے زہر میں اس قدر بجھی ہوئی نہ ہو کہ وہ دوسروں کو گھائل ہی کر دے۔ ایسا کرنا اس کی صحافتی اخلاقیات کے منافی ہوگا۔

اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ اداریہ اخبار میں شائع شدہ خبروں کی تکرار بھی نہ ہو۔ اُسے سارے حقائق کا عطر نکال کر ان کا جائزہ لیتے ہوئے منطقی نتائج تک پہنچنا ہوتا ہے۔

اداریہ کس طرح شروع کیا جائے اس کے لیے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے۔ پر یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اداریے میں تخیل طرازیوں کے لیے گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ اتنی وسعت ہوتی ہے کہ آغاز، درمیان اور اختتام کے کلاسیکی اصول کو اُتنی ہی کامیابی کے ساتھ برتا جا سکے جتنی کامیابی سے اُسے کہانی میں برتا جا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اداریہ نگار ایک آدھ تعارفی جملے کے بعد براہِ راست موضوع میں ڈوب جائے۔ وہ اپنے موضوع کے بارے میں جو کچھ لکھ رہا ہوتا ہے وہ اُس کے اُسی وقت سوچے ہوئے نتائج نہیں ہوتے بلکہ

برسوں کے غور و خوض سے حاصل کیے نتائج ہوتے ہیں جن کی روشنی میں وہ عصری حقیقتوں کا جائزہ لے رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اب اُسے ایجاز و ارتکاز کے جوہر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ دریا کو کوزے میں بند کر سکے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں اُس کی زندگی بھر کی ریاضت یعنی زبان و بیان پر حاصل کی ہوئی مہارت کام آتی ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ایک مثال ملاحظہ کیجیے جسے جناب اشفاق محمد خاں نے اپنی کتاب عوامی ذرائع ترسیل (ص ۱۹) میں اس طرح رقم کیا ہے :

"چند دن ہوئے اڑیسہ میں سمندری طوفان آنے کے نتیجے میں اس قدر مکان گرے، مویشی اور آدمی ہلاک ہوئے، فصلیں تباہ ہوئیں کہ ان سب کا اندازہ لگانا بڑی ہی مشکل امر تھا"۔

مدیر صاحب کی ریاضت اور زبان و بیان کی مہارت نے اس خبر کو ۳۴ الفاظ سے گھٹا کر صرف ۲۰ الفاظ کا بنا دیا :-

"اڑیسہ کے حالیہ سمندری طوفان سے جان و مال کا جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے"۔

اداریے میں اداریہ نگار کو اسی ہنرمندی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایجاز و ارتکاز اُس میں جادوئی اثر پیدا کر کے وہ کام کر جاتا ہے جو بسا اوقات بڑی بڑی کتابیں بھی نہیں کر سکتیں۔

ہر اخبار کے اداریے کا اسلوب جداگانہ ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایک نکتے کو اُبھارنے کے بعد اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ محض جگہ کو پُر کرنے کے لیے پس منظر یا پیش منظر کو طول دینے کی کوشش کرنا سود مند نہیں ہو سکتا۔ اداریے کی ساخت اگر سادہ ہو تو اُسے سمجھنے میں قارئین کو آسانی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں ایک اچھے اداریے کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ اداریہ اخبار کا ضمیر اور اس کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔

۲۔ یہ صداقت کو بے کم و کاست پیش کرتا ہے۔

۳۔ اس میں تخیل طرازیوں کے لیے گنجائش نہیں ہوتی۔

۴۔ یہ عصر حاضر کے کسی اہم مسئلے کو موضوع بنا کر عوام کو اُسے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

۵۔ یہ قارئین کو علم بخش کر اُن کی صحیح رہبری کرتا ہے۔

۶۔ ان کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے لیکن اشتعال نہیں دلاتا نہ اپنی رائے قارئین پر ٹھونستا ہے۔

۷۔ کسی مسئلے کے بارے میں صحیح خطوط پر غور و خوض کرنے میں قارئین کی مدد کرتا ہے۔

۸۔ کسی اہم وقتی مسئلے پر صحیح رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

۹۔ اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے کے گُر قارئین کو سکھاتا ہے۔

۱۰۔ اداریے کے لیے کسی دل چسپ سُرخی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۱۔ سادہ لیکن مؤثر زبان اداریے کے اثر کو بدرجہا بڑھا کر عوام / قارئین کی مناسب تربیت کا باعث ہوتی ہے۔

۱۲۔ عوام کے حقوق کا محافظ اور اُن کی آواز کا ترجمان ہوتا ہے۔

غور کیجیے کہ کیا گذشتہ صفحات میں انہیں نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱- خبر کی دو قسمیں ہوتی ہیں: راست خبر اور توضیحی خبر۔ اداریے کو توضیحی خبر کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

۲- یہ اخبار کا آئینہ اور اس کا ضمیر ہوتا ہے۔

۳- اداریہ اخبار کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتا ہے۔

۴- اداریہ اخبار کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کا علامیہ، اس کے نظریات و اعتقادات کا ضامن ہوتا ہے۔

۵- قوم کو کس سمت بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے اُس کا مظہر ہوتا ہے۔

۶- اخبار کی آزادی اور بالیدگی کا ثبوت ہوتا ہے۔

۷- اداریہ کا چست، مدلل، منطقی اور خوش اسلوب ہونا ضروری ہے۔

۸- یہ روزمرہ واقعات پر روشنی ڈالتا ہے اور غور وفکر کا مظہر ہوتا ہے۔

۹- عصری حالات کے رخ کے موڑنے کی بے پناہ قوت رکھتا ہے۔

۱۰- اخبارات کے اداریوں کی وجہ سے کئی سلطنتیں تہ وبالا ہوئی ہیں، کئی وزارتوں کو مستعفی ہونا پڑا ہے۔

۱۱- اداریہ، ایک معلوماتی، حقائق سے پُر، رہنما خطبہ ہوتا ہے جو غائبانہ ہزاروں سامعین کو سنایا جاتا ہے۔

۱۲- اداریہ لکھنے کے لیے اپنے خیالات سے بے لاگ وفاداری اور اُن پر یقین ہونا ضروری ہے۔

۱۳- یہ صداقت کو بے کم و کاست پیش کرتا ہے۔

۱۴- اس میں تخیل طرازی کے لیے گنجائش نہیں ہوتی۔

۱۵- یہ قارئین کو علم بخش کر اُن کی صحیح رہبری کرتا ہے۔

۱۶- اشتعال نہیں دلاتا نہ اُن پر اپنی رائے ٹھونستا ہے۔

۱۷- یہ عصر حاضر کے کسی اہم مسئلے کو موضوع بنا کر اُسے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

۱۸- کسی مسئلے کے بارے میں صحیح خطوط پر غور و خوض کرنے میں قارئین کی مدد کرتا ہے۔

۱۹- صحیح رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

۲۰- اداریے کے لیے کسی دلچسپ سرخی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۲۱- عوام کے حقوق کا محافظ اور ان کی آواز کا ترجمان ہوتا ہے۔

۲۲- سادہ اور موثر زبان اس کے اثر کو بدرجہا بڑھا دیتی ہے۔

۲۳- لب ولہجہ شائستہ ہونا ضروری ہے۔

۲۴- اداریہ براہِ راست ہونا چاہیے۔ ایک آدھ تعارفی جملے کے بعد موضوع میں ڈوب جانا چاہیے۔

۲۵- ایجاز و ارتکاز اس کی جان ہوتا ہے کیوں کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہوتا ہے وہ اداریہ نگار کے برسوں کے غور و خوض کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۲۶- ایک نکتے کو ابھارنے کے بعد اس پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔ تکرار سے بچنا چاہیے۔

# اداریے کے عناصر ترکیبی

اداریہ تحریر کرنے کے یوں تو کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں لیکن رہبری کے لیے کچھ ترکیبی ضابطے ضرور بنائے جاسکتے ہیں جن میں سے کچھ اہم ترکیبی عناصر کا ذکر نیچے کیا جارہا ہے:

۱- اداریے کو ایک دلچسپ سُرخی دی جانی چاہیے۔

۲- اداریے کا آغاز ایک مختصر سے تعارفی پیرے سے کیا جانا چاہیے۔ جس کی طوالت چند جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

۳- دوسرے پیرے سے موضوع کے بارے میں لکھنا شروع کیا جائے اور ہر پہلو کو شواہد کے ساتھ پیش کیا جائے۔

۴- موضوع کے جتنے بھی پہلو ہوسکتے ہوں اُن کے بارے میں مدلل لکھا جائے اور ہر نکتے یا پہلو کو ایک نئے پیرے کی شکل دی جائے۔

۵- کسی جملے یا نکتے کو دہرایا نہ جائے کیوں کہ آپ مضمون نہیں اداریہ لکھ رہے ہیں۔ مضمون میں زور دینے کے لیے تکرار کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ اداریے میں بات پر زور دینا مقصود نہیں ہوتا، نکتے کی وضاحت کر کے اسے سمجھنے میں قارئین کی مدد کرنا مراد ہوتا ہے۔

۶- کوئی بھی اداریہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اداریہ نگار کی مہارت، اس کا تجربہ اس کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتا ہے۔

۷- موضوع سے متعلق متن کے بعد آخری پیرے میں مستقبل کے بارے میں مناسب رویہ اختیار کرنے کے لیے مشورہ دینا ضروری ہیں۔

## نمونے

اوپر پیش کیے گئے عناصر ترکیبی کی مزید وضاحت کے لیے نیچے ہندسماچار کے دو اہم اداریے نقل کیے جارہے ہیں:

ویروار ۲۶ ستمبر ۲۰۰۲     ۱۱ اسوج ۲۰۵۹     بکرمی سمت

# سوامی نارائن مندر پر لرزہ خیز حملہ

ہم نے کل ہی لکھا ہے کہ مشرف ایک تیر سے دو نشانے کررہا ہے اس کا ایک نشانہ پاکستان سے دہشت گردوں کی بھارت میں گھس پیٹھ کراکر ان سے چھٹکارا پانا ہے اور دوسرا تشدد آمیز واقعات کرواکر بھارت کو پریشان کرنا ہے۔

گجرات میں ایسا ہی ہوا جب گاندھی نگر سوامی نارائن مندر (اکشر دھام) میں ہتھیار بند دہشت گردوں نے شام کی آرتی کے وقت مندر کمپلکس میں گھس کر اندھادھند گولیاں چلا کر عورتوں اور بچوں سمیت ۵۰ شردھالوؤں کی ہتیا کردی اور ۱۰۰ سے زیادہ کو زخمی کردیا۔ کئی زخمیوں کی حالت نازک ہے۔ دونوں دہشت گردوں کی این ایس جی کمانڈوز گروپ اور پولیس نے مندر کمپلکس میں مار گرایا اور گھرے ہوئے سبھی لوگوں کو محفوظ باہر نکالا۔

امکان یہی ہے کہ یہ دہشت گرد پاکستان سے ہی آئے ہوں گے۔ اگر یہ القاعدہ سے وابستہ تھے تو مشرف نے ان سے اپنا اور امریکہ کا پیچھا چھڑانے کا نشانہ حاصل کرلیا ہے۔ دوسری طرف مشرف اس تشدد آمیز واردات سے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کرواکر بھارت اور دنیا کا دھیان جموں و کشمیر اسمبلی انتخابات کے اگلے دو مرحلوں سے ہٹا کر گجرات اور ملک کے دوسرے حصوں میں مرکوز کروانا چاہتا ہے اس مقصد میں وہ کچھ حد تک کامیاب بھی ہوا ہے۔

پردھان منتری شری واجپئی مالدیپ کا دورہ درمیان میں چھوڑ کر کل مالے سے سیدھے احمد آباد آئے اور مندر پر حملے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ''کشمیر میں چناؤ کی کامیابی سے چڑ کر ہی دہشت گرد انتقامیہ کارروائی کر رہے ہیں اور وہ پورے ملک میں فسادات پھیلانا چاہتے ہیں لیکن سرکار ان کا مقابلہ کرنے کی اہل ہے اور دہشت گردی کو سختی سے کچلے گی''۔

اُپ پردھان منتری شری لال کرشن ایڈوانی جو مندر پر دہشت گردانہ حملے کی اطلاع ملنے پر گاندھی نگر پہنچے نے اس حملے کے لیے سیدھے طور پر پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرایا اور پرویز مشرف کی طرف سے حال ہی میں اقوام متحدہ جنرل اجلاس میں دی گئی تقریر کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا ''ہمارے دشمن نے کچھ دن پہلے سے ہی اس کے لیے پلان بنایا تھا اور اسے انجام دینے کے مقصد سے ہی یہ حملہ کیا گیا''۔

اس واقعہ سے مغربی ممالک اور امریکہ کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں کہ مشرف کس طرح دوغلی چالیں چل رہا ہے ایک طرف وہ امریکہ کے ساتھ اینٹی دہشت گردی لڑائی میں شامل ہے اور دوسری طرف بھارت میں دہشت گردانہ تشدد کروا رہا ہے۔

لیکن بھارت کو امریکہ اور اس کے ساتھیوں پر بہت زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے ان کے پاکستان کے ساتھ اپنے مفادات جڑے ہوئے ہیں اس لیے وہ اسے اقتصادی اور ہتھیاروں کی شکل میں مدد دیتے رہیں گے بھارت نے ایسے نازک وقت میں جب پاکستان کے خلاف عالمی رائے عامہ بن رہی تھی تو شری جسونت سنگھ کو ہٹا کر یشونت سنہا کو وزیر خارجہ بنا دیا۔ شری جسونت سنگھ نے پچھلے کچھ برسوں کی محنت سے جو تعلقات اور بنیادی زمین بنائی تھی اسے سمجھنے میں شری سنہا کو وقت لگے لگا۔ مغربی لیڈر بھارت آکر بھارت کی اور پاکستان جا کر پاکستان کی ہی بولی بولتے ہیں۔ ایسی حالت میں اب بھارت کو کچھ ٹھوس قدم اٹھانے چاہئیں۔

☆ بھارت کو مغرب کے بجائے اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی پر یہ دباؤ بنانا چاہیے کہ وہ پاکستان کو دہشت گردانہ سرگرمیاں روکنے کو کہے اگر وہ خود کو مسلمانوں کا خیر خواہ سمجھتے ہیں تو انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستان کس طرح دنیا کے دوسرے سب سے بڑے مسلم آبادی والے بھارت اور یہاں کے مسلمانوں کے مفادات کو چوٹ پہنچا رہا ہے۔ گودھرا قتل عام کے بعد ردعمل پھر دوسری جگہوں پر ہو سکتا ہے ایسے واقعات سے مشرف کا تو کچھ نہیں جائے گا بھارت کے ہی لوگ مارے جائیں گے۔ مسلم ممالک کو پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے اسے دی جا رہی مالی امداد بند کر دینے کی دھمکی دینی چاہیے۔

☆ دہشت گردی سے نپٹنے کے لیے فوج سیکورٹی فورسز اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کی متحد کمان ہونی چاہیے تاکہ فیصلہ لینے میں ایسی تاخیر نہ ہو جیسی کہ گاندھی نگر میں ہوئی۔ مندر پر دہشت گردانہ حملہ شام ساڑھے چار بجے ہوا اور دلّی سے این ایس جی کمانڈو رات ۱۰ بجے روانہ ہو سکے جب کہ دو تین گھنٹے کے اندر ہی یہ سب کارروائی ہو جانی چاہیے تھی۔

☆ دہشت گردی سے نپٹنے میں اہم رول ادا کرنے والے پی.ایس.گل، جے ایف ربیرو، اوپی شرما، گوربچن جگت، جنرل بی کے چھبر، اور راؤ آئی بی کے ریٹائرڈ حکام کا گروپ بنایا جانا چاہیے تاکہ وہ دہشت گردی کے خلاف حکمت عملی بنانے میں مدد دے سکیں۔

☆ سیکورٹی فورسز کو بیرکوں میں رکھنے کے بجائے ہتھیاروں سے لیس کرکے حساس علاقوں میں تعینات کیا جانا چاہیے۔ پولیس میں بھی دہشت گردی سے نپٹنے کے لیے خصوصی سیل اور افسران مقرر ہونے چاہئیں۔ پنجاب میں دہشت گردی سے تبھی کامیابی سے نپٹا گیا تھا جب بھی اضلاع میں ایس پی (آپریشن) اور ان کا اسٹاف الگ سے مقرر کیا گیا تھا۔

☆ سیکورٹی فورسز کو کارروائی کے لیے ہری جھنڈی دی جانی چاہیے اور اُن کے کام میں غیر ضروری رکاوٹیں کھڑی نہیں کی جانی چاہئیں۔

☆ سیاسی لیڈروں کو اپنی ذرا ذراسی کامیابیوں پر ڈھینگیں نہیں مارنی چاہئیں ضبط برتنا چاہیے۔ جب بھی ہمارے لیڈروں نے اپنی کامیابیاں بیان کی ہیں تبھی دہشت گردوں نے زیادہ تشدد آمیز وارداتیں کیں ہیں۔

یہ بھی ایک افسوس ناک اتفاق ہی ہے کہ جب بھی امریکہ سے کوئی سرکردہ لیڈر بھارت آتا ہے پاکستان کوئی نہ کوئی بڑا قتلِ عام کروا دیتا ہے۔ جب کلنٹن بھارت آئے تو چھٹی سنگھ پورہ میں قتلِ عام ہوا۔ وزیر خارجہ کولن پاویل اور وزیر دفاع رمسفیلڈ آئے تھے تو جموں کے رگھوناتھ مندر پر حملہ اور کالو چک قتلِ عام ہوا اور امریکہ کی جنوبی ایشیائی معاملوں کی اسسٹنٹ وزیر خارجہ کرسٹینا روکا چار روزہ دورہ پر آئیں تو دہشت گردوں نے گاندھی نگر کے سوامی نارائن مندر میں قتلِ عام کر دیا۔

سرکار کو گجرات اور دوسرے حساس علاقوں میں جہاں فوج اور سیکورٹی فورسز کو تعینات کرکے سخت سیکورٹی انتظامات جاری رکھنے چاہئیں وہیں سیاسی پارٹیاں اور دوسری تنظیموں کو دہشت گردی کے خلاف ایک آواز بلند کرنی چاہیے۔ گودھرا اور اس کے بعد کے سلسلہ وار واقعات میں ہماری سیاسی پارٹیوں کی الگ الگ بولیوں سے ہی پاکستان اور اس کے دہشت گردوں کو سوامی نارائن مندر میں قتلِ عام کرنے کا حوصلہ ہوا ہے۔

(و جے)

# ایک مجبور پِتا کی اپیل

ہمیں ہماچل کے میڈیکل کالج میں پڑھنے والے ایک طالب علم کے تشویش مند پتا کی چٹھی ملی ہے انھوں نے اس میں اپنا نام اور پتا اس لیے نہیں دیا کہ کہیں ان کے بیٹے کا کالج میں رہنا مشکل نہ ہو جائے۔

یہ چٹھی دل کو چھو جانے والی ہے۔ ایسے ہی واقعات دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی ہو رہے ہوں گے جن میں پڑھنے والے طلبا کے والدین اپنے دل کی بات کہہ پانے کا حوصلہ نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی لیے اس چٹھی کے چند اہم اقتباسات کو ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔ جس سے سرکار اور متعلقہ اداروں کے حکام ان تنظیموں میں چل رہی طلبا کی ریگنگ کے واقعات پر کنٹرول لگائیں۔

''جب سے ہمیر پور کے انجینیرنگ کالج میں ریگنگ کا افسوس ناک واقعہ ہوا ہے تب سے میں اپنے بچے کے بارے میں تشویش مند ہوں جو کہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہا ہے۔ میں معمولی تعلیم یافتہ شخص ہوں لیکن میرے بیٹے نے دن رات محنت کر کے پی ایم ٹی میں کامیاب ہو کر کالج میں سیٹ حاصل کی۔ ہم نے خود کو بہت خوش قسمت سمجھا اور بچے کو میڈیکل کالج میں داخلہ دلایا اور ہوسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام کیا۔

لیکن افسوس کی بات یہ کہ ہوسٹل میں بہت ہی غلط تجربات ہوئے ہیں سینیر طلبا کی طرف سے فریشر طلبا کو ان کی بات نہ ماننے پر تھپڑ مارنا، ہاکیوں سے پیٹنا، ذرا ذرا سی بات پر گالی گلوچ کرنا تو عام بات ہے۔ کئی مرتبہ انھیں رات کو ننگا کر کے تمام کمرے میں گھومنے، کھاٹ کے نیچے ننگے فرش پر سونے، کئی گھنٹے الماری میں سکڑ کر بیٹھے رہنے اور زبردستی ناچنے گانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ بندھوا مزدوروں کی طرح سینیروں کے اول جلول احکامات ماننے پڑتے ہیں۔

رات ۱۲ بجے سے پہلے اگر کوئی جونیئر طالب علم پڑھنا چاہتا ہے تو اسے پڑھنے نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی پڑھتا ہوا ملتا ہے تو سینیر اس کی پٹائی کرتے ہیں۔ دن بھر کالج میں پڑھائی اور کئی گھنٹوں تک سینیروں کی تفریح اور بندھوا مزدوری کرنے کے بعد تھکے ہارے یہ بچے رات بارہ بجے اپنی

پڑھائی شروع کرتے ہیں تاکہ ان کا مستقبل برباد نہ ہو۔

ان سب باتوں سے نئے طلبا کی صحت اور ذہنی کیفیت پر بے حد الٹا اثر پڑتا ہے۔ کئی بچے جو اس زیادتی کو برداشت نہیں کر پاتے ہیں وہ اپنی پڑھائی درمیان میں ہی چھوڑ کر گھر آنے کو مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کا مستقبل برباد ہوتا ہے اور ان کے والدین کی طرف سے خرچ کیے گئے پیسے بھی ڈوب جاتے ہیں۔

متعلقہ تعلیمی ادارہ ''ریگنگ کے خلاف وارننگ'' نوٹس بورڈ پر چپکا کر اپنے فرض کو پورا ہوا سمجھ لیتے ہیں جب کہ تعلیمی اداروں کو چاہیے کہ وہ ریگنگ کی بدعت'' کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے وہاں سیکورٹی کا انتظام کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو پولیس کو وہاں مداخلت کرنے کا حق دیا جائے۔ اس سیکورٹی انتظام کے لیے بچوں کے والدین مزید رقم دینے کو بھی تیار ہوں گے۔

فریشر سینئر طلبا کو اپنے بڑے بھائی اور رہنما کے طور پر مان کر آتے ہیں لیکن کچھ دادا قسم کے سینئروں کی شرارتوں کی وجہ سے وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ مجھے ہر وقت یہی تشویش ستاتی رہتی ہے کہ کہیں میرے بیٹے کا مستقبل اس طرح کی بدسلوکی سے برباد نہ ہو جائے''۔

عدالتوں اور سرکار نے تعلیمی اداروں میں ریگنگ کو روکنے کے لیے سخت قدم اٹھائے ہیں اور اس کے لیے ان کے پرنسپلوں اور منتظمین کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ریگنگ کے قصور وار طلبا کے خلاف قانونی کارروائی، اسکول سے نکالے جانے اور ۲۵ ہزار روپے تک جرمانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود کچھ شیطان سینئر طلبا کی طرف سے کئی تعلیمی اداروں میں فریشروں کے ساتھ ابھی بھی ریگنگ کی جارہی ہے۔ یہ بات اس چٹھی سے واضح ہے۔ سرکار اور تعلیمی اداروں کے منتظمین اور پرنسپلوں کو اس طرف توجہ دے کر اس دہشت کو فوراً ختم کرنا چاہیے تاکہ نئے آنے والے طلبا بے خوفی سے پڑھائی کر سکیں۔

(ج)

اداریہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں ہم ان دونوں اداریوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ ہمیں ٹھیک ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اداریے کی پہلی ضرورت اُس کا کسی عصری مسئلے پر مبنی ہونا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں اداریے حال ہی کے دو اہم مسئلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے اداریے میں سوامی نارائن مندر پر دہشت گردوں کے حملے کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے جب کہ

دوسرے میں ہماچل میڈیکل کالج میں ریگنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں موضوعات اداریے کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

اداریے کی دوسری ضرورت ان پر کسی دلچسپ عنوان کا ہونا ہے۔ پہلے کا عنوان ''سوامی نارائن مندر پر لرزہ خیز حملہ'' اور دوسرے کا ''ایک پتا کی اپیل'' ہے۔ دونوں میں دلچسپی کے عناصر موجود ہیں۔

اداریے کی تیسری ضرورت اُس کا ایک مختصر تعارفی پیرے سے شروع ہونا ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ دونوں اداریے ایسے ابتدائی پیراگراف سے شروع ہوتے ہیں جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع کا تعارف بھی کراتے ہیں۔

مندرجہ بالا تین تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اب اداریہ نگار کا کام موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ چناں چہ پہلے اداریے میں دوسرے پیراگراف سے ہم دیکھتے ہیں کہ اداریہ نگار گجرات میں گاندھی نگر کے سوامی نارائین مندر پر ہوئے دہشت گردوں کے حملے کے بارے میں بتانا شروع کرتا ہے۔ وہ ایک ایک بات کو بالترتیب بتاتا جاتا ہے۔ اس پہلے پیرے میں وہ واقعے کے حقائق پیش کرتا ہے جب کہ اگلے پیرے میں وہ دہشت گرد کون ہو سکتے ہیں اس کے بارے میں امکانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ پھر یہ بھی بتاتا ہے کہ اگر وہ پاکستانی ہیں یا القاعدہ سے متعلق ہیں، تو انھیں بھارت بھیج کر جنرل مشرف نے کیا مقاصد حاصل کیے ہیں اور ان میں اُسے کتنی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

اگلے پیرے میں وہ وزیر اعظم کی مالدیپ کے دورہ کو درمیان میں چھوڑ کر واپسی اور احمد آباد آکر اُن کے دیے بیان کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں حقائق کے عین مطابق اور اسی ترتیب سے واقع ہوئی ہیں۔

پھر حملہ ہونے کے فوراً بعد نائب وزیر اعظم ایل۔ کے۔ اڈوانی نے گاندھی نگر پہنچ کر کیا کچھ کیا اور اپنے بیان میں کیا کچھ کہا اس کا ذکر ہے۔ یہ سب کچھ بھی بے کم و کاست پیش کر دیا جاتا ہے۔ اداریہ نگار نے اپنی طرف سے ابھی تک کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

اس پیرے کے بعد اداریہ نگار اب اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کرتا ہے۔ پہلے وہ یہ کہتا ہے کہ بھارت کو مغربی ممالک پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس اسلامی ممالک کی طرف رجوع کر کے پاکستان پر دباؤ ڈلوانا چاہیے۔ وہ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ بھارت کو دہشت

گردوں کے حملوں کی ویڈیو فلمیں بنا کر سارے سفارت خانوں کو دکھانی چاہئیں ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے سیکورٹی فورسز اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کی متحد کمان بنانی چاہیے تاکہ جوابی کارروائی میں کسی طرح کی دیر نہ ہو۔ پھر وہ اُن اہم افسران کا ایک گروپ بنانے کی تجویز پیش کرتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے علاقے اور زمانے میں دہشت گردی کو کامیابی کے ساتھ کچلا ہے۔ اس میں پی، ایس، گل اجے ایف ربیرو، او، پی شرما، گوربچن جگت، جنرل، بی. کے چھبر اور راؤ آئی. بی، کے نام شامل ہیں۔ سیکورٹی فورسز کو جوابی کارروائی کی بھی کھلی چھوٹ دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کو ڈھینگیں مارنے سے اجتناب کرنے کے لیے کہتا ہے۔ کیوں کہ اُس کے خیال میں ان ڈھینگوں کی وجہ سے بھی بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ غیر ملکیوں کے دوروں کی وجہ سے بھی دہشت گردوں کو حملے کرنے کی شہہ ملی ہے۔

آخر میں وہ مشورہ دیتا ہے کہ گجرات اور دوسرے حساس علاقوں میں حکومت کی طرف سے سخت سیکورٹی انتظامات کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاسی پارٹیوں اور دوسری تنظیموں کو دہشت گردی کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ الگ الگ بولیاں بولنے سے دہشت گردوں کی کارروائی کو تقویت ملتی ہے۔

دوسرے اداریے کا موضوع اگر چہ ریگنگ ہے لیکن اس کا آغاز ایک چٹھی کے حوالے سے کیا گیا ہے جو ہماچل میڈیکل کالج میں پڑھنے والے کسی طالب علم کے والد نے گمنام طور پر اخبار کو روانہ کی ہے۔ یہاں بھی موضوع ایک حالیہ مسئلہ ہے۔ عنوان بھی دلچسپ ہے اور اس کا آغاز بھی تعارفی پیرے سے ہوتا ہے جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اداریہ نگار کے سامنے کسی پتا کا کوئی خط ہے جو اُس نے گمنام طور پر اس لیے لکھا ہے تاکہ اُس کے بیٹے کی زندگی کالج میں اجیرن نہ کردی جائے۔

چٹھی میں کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا پر اس بات کو واضح کردیا گیا ہے کہ ریگنگ کی وبا تقریباً سبھی کالجوں میں پھیلی ہوئی ہے ہمیر پور کے انجینئرنگ کالج میں ہوئے کسی اندوہناک واقعے کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا ہے کہ اُس کی وجہ سے کئی بچوں کی زندگیاں برباد نہ ہو جائیں اس فکر میں وہ دن رات پریشان رہتا ہے۔

آخر میں اداریہ نگار نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ اگر چہ حکومت نے سخت احکامات جاری کیے ہیں پر اس پر روک لگانے کے لیے مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ سرکار اور تعلیمی

اداروں کے منتظمین اور پرنسپلوں کو اس طرف خاص توجہ دے کر اس وبا کو ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

## مشق

کسی حالیہ واقعے کو موضوع بنا کر اداریہ لکھیے۔ کچھ موضوعات یہ ہو سکتے ہیں:

۱- ریاست میں دہشت گردی

۲- مسئلہ کشمیر کا حل

۳- طلبہ کا استحصال (نجی تعلیمی اداروں کے حوالے سے)

# کالم نگاری

اخبار صرف خبروں کا ہی مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اُس میں عصری مسائل پر لوگوں کی آرا کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ ان آرا کو تین طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی مسئلہ پر اخبار کی مجموعی رائے کو اداریے کے ذریعے اُبھارا جاتا ہے۔ عوام کی آرا خطوط کی شکل میں سامنے آتی ہیں جب کہ اخبار کے عملے کی آرا کو ایسے کالموں کے ذریعے خاص و عام تک پہنچایا جاتا ہے جو کالم نویسوں کے نام سے ہی مخصوص ہوتے ہیں یا ان کے نام سے چھپتے ہیں۔ ان کالموں کے لیے کسی عنوان کا ہونا بھی اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس سے خبر اور کالم میں تمیز کرنے میں قارئین کو آسانی رہتی ہے۔

کالم کے ذریعے کالم نویس اہم اور پیچیدہ عصری مسائل کی وضاحت کر کے قارئین کو نہ صرف انھیں سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ بغیر کسی طرح کی ترغیب دیے انھیں اُن کے حل کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔ اس میں پیش کیے گئے سارے خیالات کالم نویس کی اپنی آرا کے خمیر سے اُبھرتے ہیں۔ اس لیے انھیں اس کی ذاتی آرا سے ہی منسوب کر سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ آرا ایک مدت تک اُن مسائل پر غور و خوض کے بعد قائم کی گئی ہوتی ہیں اس لیے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ حق گو، حق پرست اور حق کا متلاشی ہوتا ہے۔

اداریے اور کالم میں موضوعاتی اعتبار سے اگرچہ بہت حد تک مشابہت ہوتی ہے لیکن اُن کا اسلوب ایک سا نہیں ہوتا۔ اداریے کے اسلوب کو اگر ہم رسمی قرار دیں تو کالم کے اسلوب کو ہم شگفتہ اور غیر رسمی قرار دے سکتے ہیں۔ اداریہ صرف نتائج کو پیش کرتا ہے جب کہ کالم نتائج کے ساتھ ہی ساتھ اُن اسباب کو بھی بیان کر دیتا ہے جن کی بنا پر وہ نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

کالم نویس کسی بھی مسئلے کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ اُس کی جچی تلی رائے ہوتی ہے۔ وہ کسی بات سے وقتی طور پر متاثر ہو کر اُس کے بارے میں اظہار رائے نہیں کرتا بلکہ بڑے غور و

خوض کے بعد اپنے رویوں کی تشکیل عمل میں لاتا ہے۔ اسی لیے ایک بار کسی مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے مرتب کر لینے کے بعد وہ پھر اُسے بدلتا نہیں۔ اُس پر اعتقاد کی حد تک یقین رکھتا ہے۔ چناں چہ جب اس رائے کو وہ قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے تو پوری وفاداری کے ساتھ اور دلائل و براہین کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ وہ بھی ان پر غور و خوض کر کے اُن کی صحیح نوعیت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اُن کا مقصد قارئین کو اپنی آرا سے اتفاق کرنے پر مجبور کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ کہ وہ ان کے کالم کو دل چسپی سے پڑھ کر غور و خوض کرنے کی تحریک پائیں۔

کالم کے ذریعے کالم نویس بڑے آزادانہ طریقے سے عصری مسائل یا حالاتِ حاضرہ پر اپنی رائے دیتا ہے۔ وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور غور و فکر کی مدد سے کسی مسئلے کے ایسے ایسے پہلو سامنے لاتا ہے جن کے بارے میں کسی نے سوچا تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر بات کو بڑی ذمے داری کے ساتھ رقم کرتا ہے۔

سنجیدہ کالموں کے ساتھ ہی ساتھ ایسے کالم بھی لکھے جاتے ہیں جن میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ انھیں مزاحیہ کالموں کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی اُن میں بے پناہ اثر پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ فوراً قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

کالم کو "مسلسل صحافتی" فیچر کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ تسلسل کے ساتھ ایک مدت تک جاری رہتا ہے اور ایک ہی عنوان کے تحت روزمرہ زندگی کے مسائل کو پیش کرتا رہتا ہے۔

کالم نویسی نے اب ایک معتبر پیشے کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور کالم نویسوں کو دانشوروں اور صحافیوں کے اہم طبقے میں شمار کیا جاتا ہے، جن کی آرا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امریکا میں اس لیے انھیں سیاسی پنڈت، قصیدہ گو، تیل چھڑک، چکر جھولا، ہر فن مولا اور روشن دان ایسے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر مسئلے پر ان کی رائے کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر بہت سے کالم نویسوں نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ ہمارے ہاں اس دور کے اہم کالم نویس خشونت سنگھ، خواجہ احمد عباس، راجندر یوری، کلدیپ نیر، اقبال مسعود، ابوابراہیم، رفیق زکریا اور ارون شوری وغیرہ کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔

کالموں کی مختلف اقسام کا جہاں تک تعلق ہے جناب سید اقبال قادری نے انھیں پانچ قسموں

میں تقسیم کیا ہے: رنگ برنگا کالم، ذاتی کالم، مزاحیہ کالم، سنڈی کیٹ کالم اور خصوصی کالم۔

رنگ برنگے کالم میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ہر قسم کے موضوعات کو اس میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایسے کالموں کو قادری صاحب نے چوں چوں کا مربہ بھی قرار دیا ہے۔

ذاتی کالم میں البتہ کالم نویس کسی مخصوص موضوع پر ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کی مدد سے ایسی ایسی دلیلیں چن چن کر پیش کرتا ہے کہ قاری مرعوب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی شہرت اور تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر بات کو بڑے زوردار انداز میں پیش کرتا ہے اور اپنے ذاتی خیالات پر بڑا زور دیتا ہے۔

مزاحیہ کالم میں طنز و مزاح کی مدد سے حالات حاضرہ کو زیادہ متاثر کن بنایا جاتا ہے۔ ایک ماہر کالم نویس سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی مزاحیہ کالم لکھ کر اپنے خیالات کو مؤثر بنا سکتا ہے۔

سنڈی کیٹ کالم انھیں قرار دیا جاتا ہے جو پیشہ ور ادارے تحریر کر کے اخباروں کو فراہم کرتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ اداروں کے تحریر کردہ ہوتے ہیں۔ یا وہ ادارے کالم نویسوں سے کالم خرید کر مقررہ قیمت پر اخباروں کو مہیا کرتے ہیں۔ ان کو سنڈی کیٹ کالم کہتے ہیں۔

ایسے کالم جو مخصوص موضوعات پر لکھے جاتے ہیں خصوصی کالم کہلاتے ہیں۔ یہ کالم وہ لوگ لکھتے ہیں جنھیں اس موضوع پر ماہرانہ قدرت حاصل ہوتی ہے۔ ان کا تعلق اکثر فلم، کھیل کود، صنعت و حرفت، ماحولیات، پکوان، کشیدہ کاری، فوٹوگرافی وغیرہ سے ہوتا ہے۔

غور کیجیے کہ کیا گذشتہ صفحات میں انہیں نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱- اخبار صرف خبروں کا ہی مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں عصری مسائل پر لوگوں کی آرا کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ ان آرا کو تین طریقوں سے پیش کیا جاتا ہے۔

الف۔ کسی مسئلے پر اخبار کی مجموعی رائے کو اداریے کے ذریعے پیش کر کے

ب۔ عوام کی آرا کو خطوں کی شکل میں سامنے لا کر اور

ج۔ اخبار کے عملے کی آرا کو ایسے کالموں کے ذریعے پیش کر کے جو کالم نویسوں کے نام سے ہی مخصوص ہوتے ہیں اور اُن کے نام سے چھپتے ہیں۔

۲- کالم کے لیے عنوان کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۳- کالم کے ذریعے اہم اور پیچیدہ مسائل کی وضاحت کر کے قارئین کو انھیں سمجھنے میں مدد دی جاتی ہے۔

۴- اس میں پیش کیے گئے سارے خیالات کالم نویس کے ذاتی خیالات ہوتے ہیں۔

۵- وہ ہمیشہ حق گو، حق پرست اور حق کا متلاشی ہوتا ہے۔

۶- اداریے اور کالم میں بہت حد تک مشابہت ہونے کے باوجود فرق یہ ہے کہ اداریے کا اسلوب رسمی ہوتا ہے جب کہ کالم کا غیر رسمی اور شگفتہ۔

۷- اداریہ صرف نتائج کو پیش کرتا ہے جب کہ کالم نتائج کے ساتھ ساتھ اسباب کو بھی پیش کرتا ہے۔

۸۔ کالم نویس جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی نپی تلی رائے ہوتی ہے۔ وہ کوئی بات وقتی طور پر متاثر ہو کر نہیں کہتا وہ اپنی رائے کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

۹۔ اس کا مقصد قارئین کو اپنی رائے سے اتفاق کرنے کے لیے مجبور کرنا نہیں بلکہ انھیں اس مسئلے کے بارے میں غور و خوض کی تحریک دینا ہوتا ہے۔

۱۰۔ سنجیدہ کالموں کے ساتھ ساتھ ایسے کالم بھی لکھے جاتے ہیں جن میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ انھیں مزاحیہ کالموں کے زُمرے میں رکھا جاتا ہے۔

۱۱۔ کالم کو مسلسل صحافتی فیچر کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ تسلسل کے ساتھ ایک مدت تک جاری رہتا ہے۔ اور ایک ہی عنوان کے تحت روزمرہ زندگی کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔

۱۲۔ کالموں کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) رنگ برنگا کالم

(۲) ذاتی کالم

(۳) مزاحیہ کالم

(۴) سنڈی کیٹ کالم اور

(۵) خصوصی کالم

۱۳۔ رنگ برنگے کالم میں موضوع کی قید نہیں ہوتی۔

۱۴۔ ذاتی کالم میں کالم نویس کسی مخصوص موضوع پر ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے مطالعہ و مشاہدے کی مدد سے مرعوب کن دلیلیں پیش کرتا ہے۔

۱۵۔ مزاحیہ کالم میں طنز و مزاح کی مدد سے حالاتِ حاضرہ کو زیادہ موثر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ماہر کالم نویس سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی مزاحیہ کالم لکھ کر اپنے خیالات کو موثر بنا سکتا ہے۔

۱۶۔ سنڈی کیٹ کالم وہ ہوتا ہے جنھیں پیشہ ور ادارے تحریر کرا کے اخباروں کو فراہم

کرتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کے نہیں اداروں کے تحریر کردہ ہوتے ہیں۔ یا وہ ادارے کالم نویسوں سے کالم خرید کر اخباروں کو مقررہ قیمت پر فراہم کرتے ہیں۔

۱۷۔ مخصوص موضوع پر لکھے گئے کالم کو خصوصی کالم کہتے ہیں۔ یہ کالم وہ لوگ لکھتے ہیں جنھیں اس موضوع پر ماہرانہ قدرت ہوتی ہے۔ ان کا تعلق اکثر فلم، کھیل کود، صنعت و حرفت، ماحولیات، پکوان، کشیدہ کاری، فوٹو گرافی وغیرہ سے ہوتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے نیچے چند کالمز کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

## برے دنوں میں بھی ہمت مت ہاریئے

ایک فقرہ جو میں اکثر سنتا ہوں وہ یہ کہ پیسے کا بازار تنگ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں نے اس فقرے کی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا ہے۔ اور جب لوگ یہ کہتے ہیں میں انھیں اَن سنا کر دیتا ہوں کیوں کہ یہ ہمارے دل میں مایوسی کا جذبہ رکھ دیتا ہے خاص طور پر اُس وقت جب کوئی کان کا کچا ہو۔ میرے پاس ان لوگوں کے لیے ایک کہانی ہے۔ جو ایسی باتیں سن کر مایوس ہونا نہیں چاہتے۔

ایک شخص سڑک کے کنارے رہتا تھا اور ہاٹ ڈاگ بیچتا تھا اسے کم سنائی دیتا تھا اس لیے اس کے پاس ریڈیو نہیں تھا اسے ٹھیک دکھتا بھی نہیں تھا اس لیے وہ اخبار نہیں پڑھتا تھا لیکن وہ ہاٹ ڈاگ بیچتا تھا۔

اس نے راستے میں اپنے اچھے ہاٹ ڈاگ کا بورڈ لگا دیا وہ سڑک پر کھڑا ہو کر آواز لگاتا "آیئے صاحب ہاٹ ڈاگ خریدیے" اور لوگ خریدتے تھے۔

اس نے گوشت اور رول کو زیادہ مقدار میں خریدنا شروع کر دیا اس نے روزگار کو بڑھانے کے لیے بڑا چولہا بھی خرید لیا اور اس نے اپنے بیٹے کا کالج چھڑا دیا تاکہ وہ اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ پھر کچھ ہو گیا اس کے بیٹے نے کہا "پتا جی کیا آپ نے ریڈیو نہیں سنا؟"

اس کا پتا اپنے جوان بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "مجھے کم سنائی دیتا ہے بیٹا"

"اخبار میں آپ نے تازہ خبر نہیں پڑھی؟" ۔ "میری آنکھیں بھی کمزور ہیں بیٹا" باپ بولا "کیا کوئی خاص بات ہے؟" "اس میں لکھا ہے کہ بازار میں پیسہ بہت تنگ ہے پتا جی اس کا

مطلب ہمارا دھندا خراب ہو جائے گا بیوپاریوں کو بھاری گھاٹا ہو رہا ہے حالات اور بھی بگڑ سکتے ہیں۔ آپ دھندے میں مندے کے لیے تیار ہو یئے"۔

پتا نے سوچا "میرا بیٹا کالج جاتا ہے اخبار پڑھتا ہے ریڈیو سنتا ہے اور اسے سب کچھ معلوم ہے"۔ تو اس لیے پتا نے گوشت اور رول کی مانگ کم کرادی۔

اس نے اپنا اشتہار بھی ہٹا دیا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر ہانک لگانا بھی چھوڑ دی راتوں رات اس کا دھندہ ڈوب گیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے تھے بیٹا" باپ نے ایسا ہونے پر بیٹے سے کہا "ہمیں بُرے دنوں کے لیے تیار رہنا چاہیے"۔

عجیب بات ہے۔ ہے نا؟ بیوقوفی مہا بیوقوفی؟ اور پھر بھی ہم سب ایسے ہی عورت مردوں اور اپنے دوستوں کی بات مان کر چلتے ہیں جو اپنی عقل کے مطابق صلاح دیتے ہیں۔

لوگ آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں "تم نہیں کر سکتے" ان کی طرف دھیان دینا چھوڑ دو آپ کے بُرے دن دور ہو جائیں گے۔

(بابز بنیٹر کالم)

☆☆☆

۱۔ مندرجہ بالا کالم کا عنوان اس قدر دلکش ضرور ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی ہم اسے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

۲۔ اس کالم میں کالم نویس نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اس کے اپنے خیالات پر مبنی ہے اور اُس کے برسوں کے غور و خوض کا نتیجہ ہے۔

۳۔ کالم نویس نے ایک کہانی کے ذریعے قارئین پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہار نہ ماننی چاہیے۔

۴۔ اسلوب سادہ ہی نہیں نہایت دلکش ہے خصوصاً کہانی کے عمل نے حقائق کو زیادہ موثر بنا دیا ہے۔

۵۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اس کو ذاتی کالم کے زمرے میں رکھنا چاہیے۔

کیوں کہ یہاں ادیب نے ایک انسانی موضوع کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۶- اسلوب ہلکا پھلکا اور لطیف ہے۔

۷- مصنف نے چند موثر دلائل کی مدد سے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔

## کشمیر میں انتخابی سفر جاری ہے

نئی دہلی (ایشیا ڈیفنس نیوز انٹرنیشنل) جموں اور کشمیر میں انتخابات کا عمل دسفر شروع ہو چکا ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے منشور جاری کر دیے ہیں اور امیدواروں نے اپنے اپنے پروگرام کا اعلان کر دیا ہے۔ بڑے زور شور سے ووٹروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ جرنلسٹ صاحبان کی سری نگر میں آمد شروع ہو چکی ہے۔ ان میں بہت سے صحافی ان حلقوں کا دورہ کر چکے ہیں جہاں ووٹ پہلے دور میں ڈالے جائیں گے اور پھر اس کے بعد تین دوروں میں۔

چیف الیکشن کمشنر صاحب نے ریاست کے ووٹروں کو یہ یقین دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوں گے۔ اوّل اوّل الیکشن کمیشن نے الیکٹرانک مشینوں کے استعمال کی شروعات کی ہے۔ اس سے یہ بات یقینی ہو جائے گی کہ ووٹر کا ووٹ ماسوائے امیدوار کے جسے وہ ووٹ دینا چاہتا ہے کسی دوسرے کے نام منتقل نہیں ہو سکے گا۔ پولنگ بوتھوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے تاکہ ووٹروں کو اپنے گھر سے ووٹنگ بوتھ کے سفر میں دو کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ نہ طے کرنا پڑے۔

ووٹ کے بارے میں پرچیاں اس بار امیدواروں کے ایجنٹوں کی طرف سے نہیں بلکہ خود الیکشن کمیشن کی طرف سے بھیجی جائیں گی۔ ہر پولنگ بوتھ پر پولنگ ٹیم میں پنجاب اور اتر پردیش کے افسران کو شامل کیا گیا ہے جس میں ووٹروں کو اعتماد ہے کہ جموں کشمیر کی مقامی سیاسی پارٹیاں کسی بھی طرح سے عمل رائے دہندگی میں ہیرا پھیری نہیں کر سکیں گی۔ سنئیر آئی اے ایس افسران کو انتخابی آبزرور تعینات کیا گیا ہے۔ ان آبزرور صاحبان نے انتخابات کے شروع ہونے سے پہلے کم سے کم دوبارا اپنے اپنے علاقوں کا دورہ کیا ہے۔

احساس خطرہ کے بارے میں الیکشن کمیشن کو ملی رپورٹوں کے مطابق امیدواروں کے لیے ان کے گھروں پر، ان کے دفتروں پر اور انتخابی دوروں کے دوران سیکورٹی کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود امیدواروں کو ڈرانے دھمکانے کی کوششیں تو ہونگی دہشت گردوں نے نیشنل کانفرنس کے امیدوار مشتاق احمد لون کو لولاب میں اور ایک آزاد امیدوار کو ہندواڑہ میں قتل کر دیا۔ سیکورٹی کا بندوبست ریاست کی پولیس یا نیم فوجی فورسوں کے ذریعے کیا جارہا ہے۔ پولیس پولنگ بوتھوں پر بھی گارڈ تعینات کرے گی۔ فوج اپنے بنیادی فرض کی ادائیگی میں اس بات کا بندوبست کرے گی کہ علاقہ میں ان کی برتری قائم رہے تاکہ پولیس امیدواروں، پولنگ بوتھوں اور انتخابی جلسوں کی حفاظت کا کام بخوبی کر سکے۔

ریاست کو اپنی پولیس کے علاوہ ۴۵۰ کمپنیاں پولنگ کے فرائض ادا کرنے کے لیے مہیا ہوگئی ہیں۔ الیکشن کمیشن نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ کچھ حلقوں پر خاص دھیان دیا جائے گا کیوں کہ وہ نازک علاقے تصور کیے جاتے ہیں۔ ان حلقوں میں پولیس کی زیادہ نفری تعینات کی جائے گی۔ فوج تبھی مدد کے لیے آئے گی جب سیکورٹی فورس یا دوسری نیم فوجی فورسیس اس سے مدد کے لیے درخواست کریں گی۔

سال بھر سے سرکار یہ کوشش کر رہی ہے کہ علاحدگی پسندوں اور چناؤ مخالفین کو بنیادی لہر میں لاکر انتخاب میں حصہ لینے کے لیے راضی کیا جائے۔ رام جیٹھ ملانی صاحب کی قیادت میں کشمیر کمیٹی نے ریاست کا دورہ کیا ہے اور حریت کانفرنس سے مذاکرات کیے ہیں۔

کشمیر کمیٹی نے حریت کانفرنس کے ممبران کو مختلف مسائل پر مزید گفت وشنید کے لیے دہلی آنے کی دعوت بھی دی۔ ان مذاکرات کے فوراً بعد وہ سیدھے بھاگے بھاگے نئی دہلی میں پاکستانی سفارت خانے پہنچے۔ وہاں سے ہدایات حاصل کر لینے کے بعد حریت کانفرنس کے ترجمان نے میڈیا والوں کو صاف صاف کہا کہ وہ انتخابات کا بائیکاٹ کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ انھیں پاکستان جاکر مقبوضہ کشمیر میں عبدالقیوم خان صاحب کی قیادت میں تشکیل کی گئی پاکستانی کشمیر کمیٹی سے ملاقات کی اجازت بھی دی جائے۔ اس سے عوام میں یہ تاثر ہوا ہے کہ حریت کانفرنس کے ممبران میں اپنے پاکستانی سرپرستوں کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں۔ جناب عبدالغنی لون صاحب کے نقش پر چلنے والے جو حریت ممبران اس تنظیم کو چھوڑ چکے ہیں وہ انتخابی میدان میں بھی اتر آئے ہیں اور بہت سے حلقوں میں اس کی جیت بھی یقینی ہے۔

اس طرح گزشتہ اسمبلی انتخابات کے مقابلے میں اس دفعہ کے جموں وکشمیر اسمبلی انتخابات زیادہ

دل چسپ ہوں گے قومی اور بین الاقوامی پریس الیکشن کے منظر پر بہت گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ بہت سے غیر ملکی صحافی پاکستان اور ہندوستان کے بیچ دوطرفہ ذور لگا رہے ہیں کیوں کہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے انتخابات اور جموں کشمیر اسمبلی کے انتخابات کے بیچ زمین و آسمان کا فرق تو سامنے آ کر ہی رہے گا۔ پاکستان میں 90 فی صد امیدواروں کو ووٹ دینے کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے کیوں کہ وہ ''گریجویٹ'' نہیں ہیں یعنی پاکستان دنیا کا واحد ملک ہو گیا ہے جہاں صرف بی اے۔ پاس ہی انتخابات لڑ سکیں گے۔ مگر جموں کشمیر میں تو انتخابات مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ حاصل کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ وہ تو گولی کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔

اکتوبر کے اختتام تک جموں کشمیر کی نئی ریاستی اسمبلی قیام پذیر ہو جائے گی۔ نئے نئے اقدامات کے لیے انھیں عوام کی منظوری ہوگی بہت سی متبادل تجاویز پر غور وفکر کیا جا چکا ہے۔ اس اثنا وزیر اعلیٰ اور ارون جیٹلی صاحب کے مابین بات چیت جاری رہے گی۔ کیا صدر پاکستان جو حال ہی کے اپنے سفر امریکہ سے کافی سدھر کر آئے ہیں بین السرحدی دہشت گردی کے اپنے کارنامے جاری رکھ سکیں گے۔

پاکستان ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا کہ جموں کشمیر کے انتخابات میں وہ کم سے کم لوگوں کو ووٹ ڈالنے دے تب زمانہ بھر کو واضح ہو جائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ اس لیے پاکستان اپنی بین السرحدی دہشت گردی کی ریشہ دوانیاں چھوڑے گا نہیں مگر اس سے پاکستان کو زیادہ نقصان ہوگا اور بھارت کو کم۔

(ایشیا ڈیفنس انٹرنیشنل)

۱- اس کالم کا عنوان زیادہ دل کش تو نہیں ہے پر وہ ہمارے توجہ کو ضرور اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

۲- کالم نویس کے نام کے ساتھ اس کالم کو شائع کیا گیا ہے جو بھی کالم کا تقاضہ ہے۔

۳- جموں کشمیر میں ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں کیے جانے والے انتظامات کو پوری صداقت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینے کے لیے تیار کرنے کے سلسلے میں حکومت نے جو اقدامات کیے ہیں اُن کا بھی پوری تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

۴- الیکشن کو ناکام بنانے کے لیے پاکستان کیا کچھ کرسکتا ہے اس کے بارے میں ممکنہ خدشات کا بھی ذکر ہے۔

۵- آخر میں کیا نتائج برآمد ہوں گے ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی پاکستان دہشت گردی سے باز نہیں آئے گا پر اس سے اس کا زیادہ نقصان ہوگا۔

۶- مصنف نے اپنی ہر بات کو شواہد کے ساتھ مسکت انداز میں پیش کیا ہے۔

۷- شری جینٹھ ملانی کی کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

## کیا حقیقی کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد مان لیا جانا چاہیے۔

(وی.پی.جوشی)

اتحادی سبھا کی جنرل اسمبلی میں واجپئی کے بظاہر سوجھ بوجھ والے اور سنجیدگی کا احساس دینے والے بھاشن کے مقابلے میں پاکستان کے صدر پرویز مشرف کا بھاشن جارحانہ دھونس جھانسہ دینے والا تھا۔ پاکستان کے صدر نے ڈرامائی ڈھنگ سے اپنا بھاشن پیش کیا۔ انھوں نے کشمیر سے لے کر ایٹمی دھماکوں تک کے مدعوں پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کبھی گرم تو کبھی نرم کے رجحان کو بھی ظاہر کیا۔

پاکستان کے صدر پرویز مشرف کے بھاشن میں جہاں لٹکوں جھٹکوں نے ایک الگ بھاؤ ڈالا وہیں پردھان منتری نے اپنے بھاشن، کے ہندی متن پر اپنی نظر گڑائے رکھ کر اسے پڑھا۔ ایک ہوشیار مبصر نے اس بھاشن کے بارے میں مترجم کی 'اوورواکس' کو ایک بے رس سے بھاشن کی ٹی وی ازتھ، کا بھی نام دیا ہے۔ واجپئی کے ہندی کے تیئں رجحان جس میں بھاشن کرنے میں وہ زیادہ نارمل محسوس کرتے ہیں قابل فہم ہے۔ مگر بھاشائی تعصب میں دیش بھگتی کے جوش کا مظاہرہ کرنے کی بات گلے نہیں اترتی اور اسے زیادہ تو کیا کہیں مشکوک تو کہا ہی جاسکتا ہے۔ اتحادی سبھا کی جنرل اسمبلی جیسی باڈی میں گہرے اور سنجیدہ بھاشن کو ایک ایسی بھاشا میں پیش کرنے کی کچھ سمجھ ہی نہیں آتی جسے وہاں موجود سامعین کی اکثریت سمجھ ہی نہ پاتی ہو۔ پھر اس بھاشا میں بھارت پاکستان تعلقات اور جنگ جیسے پیچیدہ مدعوں پر خیالات کے اظہار کی دلیل گلے نہیں اتر پاتی۔ یقیناً ہی یہ کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ ہندی متن کے بجائے

انگریزی متن ہی پڑھتے۔ ایک بہت قابل احترام عوامی شخصیت کے لیے جو آدھ صدی سے دیش میں اپنا ایک خاص مقام بنائے ہوئے ہے اور جس کا احترام اور مقبولیت اس کے مشہور اندازِ تخاطب اور مہارت پر مبنی رہی ہے اس کے بھاشن میں بے رس پن سے زیادہ ازتھ کی سی حالت اور کیا ہو سکتی ہے۔

اگر یہی حالت تھی تو کوئی بھی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ اتحادی سبھا کی جنرل اسمبلی میں بین الاقوامی اجتماع کی خفت کیا رہی ہوگی جو بھارت کے پردھان منتری کو ہندی متن پر محنت کرتے ہوئے دیکھ اور سن رہے تھے اس کے علاوہ اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہیں کہ شاید ہی ان کے بھاشن میں کبھی تالی بجی ہو۔ جب کہ پاکستان کے فوجی تانا شاہ پرویز مشرف کی سیاسی پختگی اور شائستگی سے تقریباً عاری رہے بھاشن کو لے کر ایسی حالت نہیں رہی۔ اور حیرانی کی ہی بات ہے کہ پردھان منتری کے ساتھ گئے جرنلسٹوں کا جو گروپ گیا تھا اس کے ایک طبقہ نے دیش لوٹ کر قومی پریس میں گھریلو خفت کے لیے بے نام غیر ملکی ڈپلومیٹوں کے حوالے سے ان کی کارکردگی پر بڑی جذباتی رپورٹ لکھی۔

مگر کشمیر مورچہ پر سب کچھ گنوا بیٹھنے کی حالت بھی نہیں بنی ہے۔ مشرف کے اشتعال انگیز بھاشن کے باوجود جسے بھارت کے سابق آرمی چیف جنرل وید پرکاش نے اہنکار جنون کا نام بڑے سوچے سمجھے ڈھنگ سے دیا ہے اور اتحادی سبھا میں واجپئی کے پھیکے اور بے رس سے بھاشن پر پھیکے سے ردِعمل کے باوجود مشہور ماہرِ قانون شری رام جیٹھ ملانی کے تحت کشمیر کمیٹی کی تشکیل موجودہ دم گھونٹو سے سیاسی ماحول میں ایک خوش آئند فضا کے بہاؤ کے مترادف ہے۔ حالاں کہ اس کمیٹی کو حریت اور دیگر علاحدگی پسند عناصر کو ودھان سبھا چناؤ میں حصہ لینے کے لیے راضی نہ کر پانے سے اپنے محدود سے مقصد کے حصول کے معاملہ میں ابتدائی دھکا بھی لگا ہے کمیٹی کی موجودہ حالات میں کافی اہمیت ہے۔ اس کمیٹی کی تشکیل کا اعلان ہونے سے کئی دن پہلے ایک سرکردہ روزنامہ میں جیٹھ ملانی نے اپنے جن متوازن اور اچھے خیالات کا اظہار ایک لیکھ میں کیا تھا اس کی روشنی میں نئی سوچ کی امید پیدا ہوئی ہے۔

کشمیر مدعا پر نقطۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی کی زبردست مانگ کرنے کے ساتھ ہی جیٹھ ملانی نے خاص طور پر اپنی سوچ کا یہ نچوڑ پیش کیا ہے کہ سیاسی لیڈر کو لمبے عرصہ سے چلی آ رہی اپنی غیر لچکدار سوچ کو ترک کرنا ہوگا۔ ماضی کی غلطیوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اور یہ سمجھ لینا ہوگا کہ فی الحقیقت یہ اتحادی سبھا کے چارٹر کے تحت ایک بین الاقوامی جھگڑا ہے جس میں پاکستان بھی ایک فریق

ہے۔ اس کے بعد اسے چارٹر کے مطابق ہی حل کرنا ہوگا جو دونوں فریقوں پر بات چیت کرنے کی ذمہ داری صاف طور پر ڈالتا ہے اس میں ناکامی ہو تو وہ بین الاقوامی قانون کے تحت مادھیستھ کا یا ثالثی فیصلہ کی ویوستھا دیتا ہے۔ بھارتی آئین کے ہدایتی اصول بھی بین الاقوامی امن اور سکیورٹی کو قائم رکھنے کے لیے بین الاقوامی جھگڑوں میں شامل فریقوں پر ثالثی کی ویوستھا کو شامل کرتے ہیں۔

مدھیستھ پر زور دیتے ہوئے جیٹھ ملانی کہتے ہیں ''ثالثی اور مدھیستھا کے تئیں ہماری الرجی، اس بھے پر مبنی ہے کہ دنیا میں کوئی ایماندار ثالث یا مدھیستھ ہے ہی نہیں۔ دنیا کی حالت میں بھاری بدلاؤ آچکا ہے، سرد جنگ ختم ہوگئی ہے، ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جمہوری جگت کے ساتھ حصہ دار کے طور پر وابستہ ہیں۔ یہ سوچنا احمقانہ ہی ہے کہ کوئی ایماندار مدھیستھ رہا ہی نہیں ہے۔ امریکنوں نے کرگل جنگ روکی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ اور دونوں کی طرف سے ہی مدھیستھا کا سواگت کیا جانا چاہیے۔

یہ بھی واضح ہے کہ کشمیر کنٹرول لائن دونوں طرف کے لاکھوں بے بس لوگوں کو مشکلات سے نجات دلانے کے لیے کسی دلیرانہ پہل کیے جانے کے لیے پکار رہا ہے۔ مگر جیٹھ ملانی واضح الفاظ میں یہ سجھاؤ دینے سے چوک گئے ہیں کہ کنٹرول لائن کو بین الاقوامی لائن میں بدل دینا چاہیے جیسے کہ وہ عملی طور پر ہے ہی۔ صرف یہی عملی اور مناسب اور نتیجہ خیز حل ہے جب کہ فی الحال یہ لائن ایسی دہکتی لائن بنی ہوئی ہے کہ دونوں اطراف کے بے گناہوں کی جانیں لے رہی ہے۔ مگر معقول حقیقت پسندانہ طریقِ رجوع پر عمل کرنے سے پہلے کچھ مروج خیالات کو سمجھنے اور ان کے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سے اس پیچیدہ پہیلی کو سلجھانے کا راستہ ہموار کیا جاسکے گا۔ بھارت میں یہ فضول دھارنا بنی ہوئی ہے کہ پاکستانی کنٹرول لائن کو مستقل سرحد کے روپ میں تسلیم کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ عام لوگ اور سوجھ بوجھ والے طبقوں کا ایک بڑا حصہ یقیناً ہی اس حل کا سواگت ہی نہیں کرے گا بلکہ اس کی تعریف بھی کرے گا۔ بھارت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ حالاں کہ شروع میں شور شرابے والے مخالف اور انتہا پسند دھڑوں کی طرف سے دونوں ہی دیشوں میں زبردست مظاہروں کا سلسلہ بھی ابھر سکتا ہے۔ اس طرف دھیان دینا ہوگا کہ پاکستان میں بھی اچھی سوجھ بوجھ والے لوگ ہیں اور دونوں ہی دیشوں میں خاموش اکثریت کی یہ دلی خواہش ہے کہ خون خرابے کا سلسلہ بند ہونے کے لیے باہمی اتفاق رائے سے حل تلاش کیا جائے۔

پاکستان لمبے عرصے سے ثالثی کی مانگ اس امید سے کرتا ہے کہ اس سے اس کے حق کے تئیں یہ موافق رہے گا۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے حالات میں بھی بھاری تبدیلی آگئی ہے اور امریکہ نے جو ہاو بھاو دکھایا ہے اس سے بھی یہی امید کی جاتی ہے کہ کوئی بھی ثالثی بھارت اور پاکستان دونوں کے لیے متوازن ہوگی۔ ہم مانیں یا نہ مانیں نئی دہلی اور اسلام آباد کے بیچ مغربی طاقتوں کے نمائندوں کی آمدورفت بین الاقوامی مداخلت اور ثالثی کی ہی مظہر ہے۔

یہ بھی نوٹ کیا جانا چاہیے کہ کنٹرول لائن کو مستقل بین الاقوامی سرحد میں بدلنا جس پر کشمیر کے دونوں حصوں کے لوگوں کے بیچ تال میل کی رسائی ہو۔ اب تو کیا پچاس برس بعد بھی اس سے بہتر باہمی طور پر اتفاق رائے سے کیا اور پرامن حل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ سلسلہ واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ کسی بھی دیش کے لیے فوجی حل تلاش کرپانا ناممکن ہے۔ دونوں دیشوں کے سیاسی اور فوجی لیڈر اپنے دل میں اس حقیقت سے واقف ہیں پھر بھی ہر فریق بات چیت کے ہر منچ پر سودے بازی کی حالت بنائے رکھنے کے لیے کشمیر کے دوسرے حصہ پر دعویٰ جتا رہا ہے۔ اپنے اپنے دیش واسیوں میں اپنی دلیرانہ ساکھ بنائے رکھنے کے لیے بھی ایسا کیا جارہا ہے۔

موجودہ بین الاقوامی ماحول میں پیچیدہ مدعوں پر گہرائی سے نظر ثانی ضروری ہے اور دلیرانہ پیش قدمیوں کی بھی فوری ضرورت ہے۔ اور خاص طور پر امریکہ اور برطانیہ کنٹرول لائن کے آدھار پر اس مسئلے کو حل کراسکتے ہیں یہی وقت ہے جب تیسرے فریق کی طرف سے ثالثی نہیں کی روکاوٹ کو ہٹا دیا جائے جیسا کہ جیٹھ ملانی نے بھی مطالبہ کیا ہے۔ اس میں کوئی توہین آمیز بات نہیں ہے۔ بھارت اور پاکستان دونوں کے مفادات اسی میں مضمر ہیں امریکہ اور برطانیہ کی ثالثی پر زور دیے جانے کے باوجود شری جیٹھ ملانی اس کشمیر کمیٹی کے صدر ہیں جسے غیر سرکاری بھلے ہی کہا گیا ہے اسے زمینی حقیقتوں کو تسلیم کرنے کا ایک قابل تعریف احساس بھی کہا جاسکتا ہے۔

(مندرا پبلیکیشنز)

۱- اس کالم کا عنوان بھی دل چسپ ہے۔

۲- کالم نویس کا نام بھی جلی حروف میں چھاپا گیا ہے۔

۳- لگتا ہے یہ کالم مندرا پبلیکیشنز نے وی ٹی جوشی سے لکھوا کر اخباروں کو فراہم کیا ہے۔ یعنی مصنف سے خرید کر اخباروں کو بیچا ہے۔

۴- اس میں مصنف نے جن خیالات کو پیش کیا ہے وہ اس کے برسوں کے غور و خوض کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا یہ کہنا کہ بھارت کو امریکہ کی مدد حاصل کر کے بات چیت سے کشمیر کے مسئلے کو حل کرنا چاہیے کیوں کہ طاقت سے کوئی حل سامنے نہیں آسکتا ہے ایک دانشورانہ تجویز ہے۔

۵- بھارت سرکار کو یہ مشورہ دینا کہ کشمیر کو ایک بین الاقوامی مسئلہ کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیے بھی ایک جرات مندانہ قدم ہے۔

۶- اس میں مصنف نے حق گوئی کا ثبوت دیا ہے۔

۷- کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لینے کے مشورے اور لوگوں نے بھی دیے ہیں پر یہاں مصنف نے اس بات کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بڑا موثر ہے۔

۸- مصنف کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ایسا کرنے سے سرحد کے دونوں طرف بسنے والے لوگوں کا خون مزید بہنے سے بچ جائے گا۔

۹- زبان عام فہم اور ہندوستانی ہے جس سے مسئلے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

## مشق

۱- درج ذیل موضوعات میں سے کسی ایک پر ذاتی کالم تحریر کیجیے۔

(الف) سرکاری دفاتر میں رشوت ستانی

(ب) تعلیمی اداروں میں بدنظمی

(ج) بڑھتی ہوئی مہنگائی

۲- درج ذیل میں سے کسی ایک موضوع پر مزاحیہ کالم لکھیے:

(الف) وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

(ب) حکومت کی سرد مہری

# اخباری فیچر

اخباری فیچر کے لفظی معنی خصوصی مقالے کے ہیں۔ یعنی ایک ایسا مقالہ یا مضمون جس کا تعلق وقت کی کسی اہم ضرورت، واقعے یا حادثے سے ہو اور جسے اخبار ایک اہم موضوع وقت ہونے کی وجہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے کالموں میں جگہ دے۔

اخبار میں فیچر دو اہم کردار ادا کرتا ہے :-

(۱) یہ خبر جسے صحافت کی زبان میں خبری کہانی بھی کہہ سکتے ہیں، کی معاونت کر کے اُسے وزن و وقار عطا کرتا ہے۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ خبر کے ذریعے پیش کیے گئے کسی واقعے، حادثے یا بات میں اتنی جان نہیں ہوتی کہ لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوں۔ چناں چہ اُسی بات کو فیچر کے ذریعے پیش کر کے اس حد تک جاذبِ نظر بنا دیا جاتا ہے کہ لوگ اُسے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

(۲) کسی اہم عصری مسئلے کے بارے میں تفصیل سے معلومات فراہم کرتا ہے۔ بہت سے ایسے پہلو جنھیں خبر میں پیش نہیں کیا جا سکتا اس میں دلائل و براہین اور مشاہدات و تاثرات کے ساتھ رقم کیے جا سکتے ہیں۔

مسٹر برائن نکولس اپنی کتاب FEATURES WITH FLAIR میں فیچر کے عناصر ترکیبی کی نشاندہی یوں کرتے ہیں :

۱۔ ”خبر یا خبری کہانی خیالات یا حقائق کو پیش کرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن فیچر کی کہانی اُس سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ پس منظر، واقعے یا خیال کے آغاز و ارتقا کو دریافت کرتے ہوئے مستقبل کی بھی جھلک دکھاتی ہے۔ وہ قارئین کو بتاتی ہے کہ آپ یا لکھنے والا یا کوئی دوسرا اس واقعے یا خیال کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ وہ قاری کو زیادہ پسند آتا ہے۔

۲۔ فیچر کی کہانی محض حقائق کا بیان نہیں ہوتی بلکہ حقائق اور اُن سے وابستہ خیالات کی

شاعرانہ پیش کش ہوتی ہے تاکہ اُن گوشوں کو روشن کیا جاسکے جو اہم تو ہوتے ہیں لیکن سرسری نگاہ ڈالنے والے کو نظر نہیں آتے۔

۳۔ فیچر، خبر (خبری کہانی) سے کہیں زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ان معلومات کا تعلق چاہے مسئلے کے کسی ایک ہی پہلو سے کیوں نہ ہو پر خبر بھرپور ہوتی ہیں۔ متعلقہ موضوع کے سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ کیا، کیوں، کس طرح، کہاں؟ ایسے سوالات جن کا تعلق خبر سے ہوتا ہے اور جو اکثر خبر پیش کرتے وقت صحافی یا نامہ نگار کے سامنے ہوتے ہیں اور خبر کی صحت برقرار رکھنے میں اُس کے ممد و معاون ہوتے ہیں، اُن سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ فیچر کی قوت اور اُن کی شناخت تک کا انحصار خیال کی مناسب پیش کش پر ہوتا ہے۔ یہ اُن مخصوص صداقتوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے جو لوگوں میں تجسس، ہمدردی، شک و شبہے، مزاح، نفرت اور حیرانی ایسی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔

۵۔ فیچر اس اعتبار سے خبر (خبری کہانی) کی طرح ہی ہوتا ہے کہ وہ قارئین کو دل چسپ انداز میں حقائق تک پہنچاتا ہے اور اُسی کی طرح روانی سے پڑھا جاسکتا ہے لیکن اس میں مطالعے، تحقیق اور انٹرویو کی وجہ سے پڑھنے والوں کی تعلیم و تربیت، رہبری اور حظ و انبساط فراہم کرنے کی قدرت زیادہ ہوتی ہے۔ چناں چہ یہ معلومات میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم و تربیت، رہبری اور حظ و انبساط کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔

۶۔ اس کا تعلق کسی نہ کسی وقتی صداقت یا خبر سے ہوتا ہے جسے خاصی تعداد میں لوگ پسند کرتے ہیں۔

۷۔ یہ اخبار میں شامل قدرے طویل ٹکڑے ہوتے ہیں۔ ایک ایسی تحریر جو مسائل کو مطالعے، تحقیق اور انٹرویوز کی مدد سے زیادہ جامع اور واضح بناتی ہے۔

۸۔ فیچر کو حقائق کی دید و دریافت بھی کہہ سکتے ہیں جس کا مقصد رہبری کرنا، تعلیم دینا یا محظوظ کرنا ہوتا ہے[1]۔

فیچر کو اُس وقت تک پورے طور پر سمجھا نہیں جاسکتا جب تک کہ پہلے یہ نہ جان لیا جائے کہ

---

1. D.S. Mehta, Mass Communication and Journalism in India (Allied Publishers Private Limited 1979) P. 84-85

توضیحی خبر اور فیچر کے درمیان کیا فرق ہے۔ (توضیحی خبر کی تعریف پیچھے کی جا چکی ہے) ان دونوں کے درمیان فرق کا پردہ اس قدر باریک ہے کہ اسے صرف وہی نظر پہچان سکتی ہے جو ان دونوں کے فن سے کما حقہ واقف ہو۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی حدود پھلانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ایک باریک بین آنکھ ہی خود کو دھوکے سے بچا سکتی ہے اور اُن عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتی ہے جو ان دونوں کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔

آیئے ایک بار پھر اس بات کو سمجھ لیں کہ خبر، واقعات کا معروضی اور بے کم و کاست بیان ہوتی ہے۔ اس میں نامہ نگار یا صحافی خود کو حقائق تک محدود رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان بنیادی چھے سوالوں کا جواب دیتا ہے جو ایک تحریر کو خبر (خبری کہانی) بناتے ہیں۔ اس کا مقصد حقائق پیش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خیال رکھنا بھی ہوتا ہے کہ بیان دل چسپ بھی ہو۔

دوسری طرف فیچر، خبر (خبری کہانی) سے بہت آگے تک کا سفر کرتا ہے۔ وہ خبر کے دائرے میں وسعت پیدا کر کے اُسے نئی جہتیں عطا کرتا ہے۔ قوس و قزح کی مانند نئے رنگ اُس سے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ خبر کا جائزہ ایک ماہر جراح کی طرح لیتے ہوئے اُس کے ایک ایک ریشے کو الگ الگ کر کے دیکھتا ہے اور سارے پہلوؤں کو اُجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ اُس کا مقصد محض معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا۔ وہ علم میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ قارئین کی رگِ تجسس کو پھڑکاتا اور طرح طرح کے انسانی جذبوں کو جگا کر قاری کی رُوح سے براہِ راست رشتہ قائم کرتا ہے۔ وہ پس منظر کو ہی دریافت نہیں کرتا بلکہ تحقیق و تجسس سے ہر واقعے اور ہر خیال کی چھان پھٹک کر کے حقائق کے بوقلموں پہلوؤں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اُس کی کائنات لامحدود ہوتی ہے۔ اس بات کو مندرجہ ذیل مثال کی مدد سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کر لیجیے کہ کہیں کوئی ریل کا حادثہ پیش آگیا ہے جس میں بہت سے لوگ جاں بحق ہوئے ہیں۔ خبر کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس حادثے کے حقائق اور دوسرے متعلقات یعنی کب، کہاں، کیسے اور کیوں ایسے سوالات کا جواب دے کر مطمئن ہو جائے گی یا یہ سمجھ لے گی کہ اس کا فرض پورا ہو گیا کیوں کہ اُس کا کام قارئین کو صرف مطلع کرنا ہے کہ کس جگہ پر کب، کیا، کیسے اور کیوں کوئی حادثہ ہوا اور اس سے کس قدر نقصان ہوا۔ لیکن اس کے مقابلے میں فیچر

نگار صرف انھیں معلومات کو فراہم کر دینا کافی نہیں سمجھے گا۔ وہ اُن پہلوؤں کو خاص طور سے تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کرے گا جنھیں خبر نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً وہ معلوماتی پہلوؤں کے ساتھ ہی ساتھ حادثے کا شکار ہونے والوں کے لواحقین یا اُن کے رشتے داروں کے انٹرویو لے کر اسے مزید دل چسپ بنائے گا یا حادثے میں بچ جانے والوں کے انٹرویوز شائع کر کے فیچر کو دل چسپ ہی نہیں موثر بنانے کی کوشش بھی کرے گا۔ وہ حادثے کے پیش نظر حادثے سے پہلے یا روانہ ہونے سے پہلے ریل کی تکنیکی صورتِ حال، معائنے کی خامیوں یا معائنہ کرنے والوں کی لاپروائی وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کر کے اپنے فیچر کو جاذبِ نظر ہی نہیں حکام کے لیے تازیانے کے طور پر بھی برتنے کی کوشش کرے گا۔ حادثے میں ہوئے جانی ومالی نقصان کے بارے میں تحقیق و جستجو کے ذریعے اعداد و شمار جمع کر کے اپنے فیچر کو علمی تحریر بنا دے گا جس سے اس کا پایۂ استناد بہت بلند ہو جائے گا۔

فیچر اور خبر کے مابین اور بھی کئی طرح کے امتیازی پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً اُس کا حجم اور اسلوب خبر سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی فیچر ہمیشہ خبر سے زیادہ جگہ لیتا ہے اور اس کا اسلوب زیادہ تخلیقی ہوتا ہے۔ اسی طرح خبر ہمیشہ کسی نہ کسی تازہ ترین واقعہ کو پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی کائنات میں وقت کی قربت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر خبر میں ایسا باسی پن پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے پڑھنے سے کسی کو دل چسپی باقی نہیں رہتی۔ آج کے دور میں صبح ہونے والا کوئی واقعہ دوپہر تک بھی اپنی تازگی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ شام تک لوگ اُس کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اس تیز رفتار دور میں خبر کا تازہ سے تازہ تر ہونا ہی اُس کی حرمت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ لیکن فیچر کا جہاں تک تعلق ہے اُس کے لیے اس طرح کی شرط نہیں لگائی جا سکتی۔ فیچر کا کسی تازہ ترین موضوع پر مبنی ہو۔ ضروری نہیں ہے۔ اگر فیچر نگار فن آشنا ہے اور اس کے قلم اور فن میں جان ہے تو وہ باسی موسوع کو بھی دل چسپ بنا سکتا ہے۔ تاہم اس کی کامیابی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس موضوع سے عوام کی دل چسپی اُس وقت تک باقی ہو۔ جب تک موضوع اس شرط کو پورا کرتا ہے اُس پر ایک نہیں کئی فیچر لکھے جا سکتے ہیں۔

ایجاز و اختصار بھی خبر کی جان ہے۔ خبر میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اُس میں تخیل طرازیوں سے کام لیا جائے۔ یا اُسے داستان کی طرح کھینچنے اور قصہ در قصہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ خبر براہ راست اپنے موضوع تک پہنچتی ہے۔ اس میں تمہید، پس منظر یا غیر ضروری تفصیلات کے لیے جگہ نہیں ہوتی۔ وہ نامہ نگار یا صحافی کی بے جا دخل اندازی کو

برداشت نہیں کرتی۔ وہ اپنے اور قاری کے بیچ میں کسی دوسرے کو آنے نہیں دیتی۔ وہ قاری سے براہِ راست، بلاواسطہ اور سیدھے سادے انداز میں خطاب کرتی ہے۔ اس کی کائنات میں لفظ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ لفظ کو استعاروں کی طرح نہیں سامنے کے معنوں میں استعمال کرتی ہے وہ انھیں علامتوں یا پیکروں کے طور پر برتنے سے بھی گریز کرتی ہے۔

اس کے مقابلے میں فیچر کو بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کو کسی بھی طرح برت سکتا ہے، بسا اوقات وہ اپنے سچ کو مؤثر بنانے کے لیے تخلیقی زبان کو برتنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رکھتا ہے کہ اُس کا بیان مبالغے کی اُس حد تک نہ جا پہنچے کہ جہاں اس کی سچائی دھندلی پڑ جائے۔ سچ کو دھندلا کرنے کی اُس کو اجازت نہیں۔

خبر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے مقامات سے تعلق رکھتی ہو جو اخبار کے دفتر سے زیادہ دور نہ ہو۔ فاصلے کی قربت خبر کو زیادہ دل چسپ بناتی ہے۔ یا عوام فطری اعتبار سے قریب یا اپنے ارد گرد کے واقعات میں زیادہ دل چسپی لیتے ہیں۔ دور کی خبر میں وہ دل چسپی نہیں ہوتی جو قریب کی خبر میں ہوتی ہے۔ فیچر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے وہ اپنے قارئین کو کہیں کی بھی سیر کرا سکتا ہے بشرطیکہ قارئین کی دل چسپی کو برقرار رکھ سکے۔

خبر اپنے اسلوبِ تحریر کے اعتبار سے بھی فیچر سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ چوں کہ جلدی جلدی لکھی گئی ہوتی ہے اس لیے اس کے اسلوب میں وہ حُسن پیدا نہیں ہو پاتا جو فیچر میں ممکن ہوتا ہے۔ فیچر کو چوں کہ باسی ہو جانے کا ڈر نہیں ہوتا اس لیے اسے فرصت کے لمحات میں لکھا جاتا ہے جس سے اس کے اسلوب میں ایک ایسا حُسن پیدا ہو جاتا ہے جو قارئین کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ خبر وقت کے جبر کا شکار ہو کر محض معلومات کا پلندہ بن کر رہ جاتی ہے جب کہ فیچر معلومات کا پلندہ بننے کے ساتھ ہی ساتھ لطف و انبساط کے جوہر سے بھی آراستہ ہوتا ہے اور اس طرح معلومات کے ساتھ ہی ساتھ حظ کی ترسیل کا بھی باعث ہوتا ہے۔ خبر کا حُسن ایجاز و اختصار میں ہوتا ہے جب کہ فیچر کا شرح و بسط میں۔ فیچر نگار فیچر کو رنگین اور کہانی کے اسلوب میں لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو بڑے دل چسپ اور پُر لطف انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ یہاں اُسے بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنا منفرد اسلوب بنا سکتا ہے۔ خبر میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہاں سادگی اور اکہرا پن ضروری ہوتا ہے تاکہ واقعات کو معروضی انداز میں رقم کیا جا سکے۔

خبر لکھتے وقت نامہ نگار اس کی کوئی سرخی مقرر نہیں کرتا۔ اُسے کوئی عنوان نہیں دیتا۔ یہ کام اس کا اڈیٹر یا سب اڈیٹر انجام دیتا ہے۔ فیچر میں عنوان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہی نہیں اس کا پُر کشش ہونا بھی ضروری تصور کیا جاتا ہے تاکہ نظر پڑتے ہی قاری اُس کی طرف کھنچا چلا آئے۔ فیچر نگار اپنے فیچر کے لیے جتنا پُرکشش عنوان تلاش کرنے میں کامیاب ہوگا اس کا فیچر اتنا ہی زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب ہوگا۔

فیچر کا آغاز بھی خبر سے مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ خبر کی ابتدا میں خبر کو جس اختصار کے ساتھ پہلے پیش کردیا جاتا ہے اس طرح کے خلاصے کی یہاں فیچر میں ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں ابتدائیے میں مرکزی خیال کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حدود کے بارے میں معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ فیچر کا آغاز کسی قول، شعر، مکالمے یا گفتگو سے ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس کا موضوع سے تعلق ہو۔ خبر میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

فیچر کے حجم کا دارومدار اخبار کی ضرورت پر ہوتا ہے۔ اخبار کے صفحے کی لمبائی اور چوڑائی اُس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ فیچر میں مخففات کے استعمال سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے۔ اس کے پیرے خبر کے پیروں سے طویل ہوتے ہیں۔ اس کا اسلوب ادبی، رنگین اور مزین ہوتا ہے۔ فیچر اپنے اندر مکمل ہوتا ہے۔

خبر میں لکھنے والے کا نام نہیں ہوتا جب کہ فیچر میں ہمیشہ لکھنے والے کا نام دیا رہتا ہے۔ خبر صیغۂ واحد غائب متکلم میں لکھی جاتی ہے جب کہ فیچر میں تینوں صیغوں کا استعمال جائز تصور کیا جاتا ہے۔

فیچر کی تیاری کے لیے جن امور کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے انھیں مختصراً یوں پیش کیا جاسکتا ہے :-

۱۔ موضوع مخصوص نوعیت کا ہو۔

۲۔ مسئلے کے صرف ایک یا دو پہلوؤں پر قلم اُٹھایا جائے۔

۳۔ کسی مخصوص زاویہ نگاہ کو پیش کیا جائے۔

۴۔ کسی عصری واقعے سے تعلق ہونا بھی ضروری ہے۔

۵۔ مواد کی فراہمی کو ذہن میں رکھ کر موضوع کو منتخب کیا جائے۔

۶۔ ایسی باتیں کہی جائیں جواب تک نہ کہی گئی ہوں۔

۷۔ ضرورت پڑنے پر انٹرویوز وغیرہ کی مدد سے فیچر کو دل چسپ بنایا جائے۔

۸۔ اسلوب رنگین، بیانیہ اور تصوراتی ہو۔

۹۔ تصویروں کی مدد بھی لی جائے۔

۱۰۔ اچھا کاغذ، اچھا ٹائپ اور اچھا عنوان بھی فیچر کو دل چسپ اور پُر کشش بنا دیتا ہے۔

۱۱۔ حجم اخبار کی ضرورت کے مطابق ہو۔

فیچر اور مقالے کے درمیان بھی بہت سی مشترک خصوصیات کے باوجود ایسے عناصر تلاش کیے جا سکتے ہیں جو انھیں نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف بناتے ہیں بلکہ انفرادیت بھی عطا کرتے ہیں۔ مشترک خصوصیات کا جہاں تک تعلق ہے دونوں کا اسلوب خبر کے اسلوب سے مختلف ہوتا ہے۔ دونوں کی کامیابی کا انحصار نثری اسلوب کی خوبی پر ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اسلوب سے استفادہ کرتے ہیں۔ کبھی فیچر مضمون کا اسلوب اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی مضمون فیچر کی حدود میں داخل ہوتا نظر آتا ہے۔ ان مشترک عناصر کے باوجود دونوں میں ایسے پہلو بھی ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ مثلاً مضمون ہمیشہ کسی نہ کسی ایسے موضوع پر لکھا جاتا ہے جو وسیع ہو۔ یعنی اس میں کسی موضوع کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں فیچر ہمیشہ خصوصی نوعیت رکھتا ہے۔ یعنی وہ کسی مخصوص پہلو پر تفصیل سے نظر ڈالتا۔ اُس مخصوص پہلو کے اندر جو مختلف پہلو مضمر ہوتے ہیں ان کو سامنے لاتا ہے اس طرح اس کا دائرۂ عمل مضمون کے مقابلے میں محدود ہوتا ہے۔ اس میں کسی موضوع کے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پہلوؤں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ کسی ایک ذہنی کیفیت کو بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مضمون میں طریقۂ کار عمومی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ جب کہ فیچر میں اسے خصوصی نوعیت حاصل ہوتی ہے۔ مضمون نہ صرف مفصل ہوتا ہے بلکہ اُس میں مصنف اپنے عندیے کو دلائل و براہین اور شواہد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مطالعے اور تحقیق سے کام لے کر اپنی بات کو وزن و وقار عطا کرتا ہے۔ یہ عالمانہ سنجیدگی کی شان رکھتا ہے۔ اس میں ضرورت پڑنے پر حقائق کے ساتھ ہی ساتھ اعداد و شمار اور ہندسوں کو بھی برتا جاتا ہے۔

فیچر دل کی پیداوار ہوتا ہے جس کا انحصار احساسات و جذبات پر ہوتا ہے۔ اس میں فیچر نگار لوگوں، جگہوں اور واقعات کے سلسلے میں ردِ عمل کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس کا اسلوب بھی بہت ہی ہلکا پھلکا اور لطیف ہوتا ہے۔ اس میں اُس طرح کے اعداد و شمار اور ہندسے نہیں

برتے جاتے جس طرح اُنھیں مضمون یا مقالے میں برتا جاتا ہے۔

حجم کے اعتبار سے بھی یہ دونوں ایک سے نہیں ہوتے۔ مضمون کا حجم فیچر سے طویل ہوتا ہے۔ فیچر میں معلوماتی اور تعلیمی مواد کے ساتھ ہی ساتھ تفنن طبع کے سامان بھی ہوتے ہیں۔ مضمون کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تعلیمی یا تفریحی سامان بھی فراہم کرے۔

مضمون کا اسلوب عام طور پر پُر تکلف، بھاری بھرکم، سنجیدہ اور مطالعاتی ہوتا ہے۔ دل چسپی کے سامان نہ ہوتے ہوئے بھی یہ چل جاتا ہے۔ فیچر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اُس کا اسلوب بے تکلفانہ اور رنگین ہوتا ہے۔ پھیکا پن اس کے لیے مہلک ہے۔ فیچر کسی واقعہ یا خیال کو ڈرامائی یا نثری اسلوب میں پیش کر کے قارئین کے لیے حظ و انبساط کے سامان فراہم کر سکتا ہے تاکہ وہ انھیں زیادہ پسند آئے۔

مضمون کو چوں کہ اکثر کسی ایسے شخص نے لکھا ہوتا ہے جو اس پر ماہرانہ قدرت رکھتا ہے اس لیے اُس میں مصنف کی ذاتی رائے بھی شامل ہو جاتی ہے۔ مضمون نگار تحقیق و مطالعے کے بعد نتائج اخذ کر کے اپنی رائے دیتا ہے۔ فیچر میں ذاتی رائے بھی دوسروں کی وساطت سے پیش کی جاتی ہے۔ مضمون کی ہیئت آغاز، درمیان اور اختتام کے روایتی ضوابط کے مطابق تشکیل پاتی ہے جب کہ فیچر کے لیے ایسا ضروری نہیں ہے۔ وہ اچانک شروع ہو کے کسی ایسے ہی موڑ پر ختم بھی ہو سکتا ہے۔

فیچر کو اگر ہم نثری غزل کے نام سے موسوم کریں تو شاید بے جا نہ ہو۔ یعنی الفاظ میں پیش کی گئی کوئی وقتی کیفیتِ مزاج۔ مضمون بیک وقت بہت سی کیفیتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون کو اگر ہم کسی ایسے محل سے تشبیہ دیں جس کی بہت سی منزلیں اور کمرے ہوتے ہیں تو فیچر کو ہم ایک صاف و شفاف جھونپڑی سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔ مضمون اگر کسی تند و تیز دریا کی مانند ہوتا ہے تو فیچر کسی کلکلاتی آبجو کی مثال۔

ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کے لیے جناب سید اقبال قادری یوں رقم طراز ہیں :

> "کسی ایک خصوصی مضمون کے لیے مستند کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پس منظر زیادہ صحت اور عمدگی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اعداد و شمار جمع کرتے وقت کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر فیچر لکھنے کے لیے آنکھوں اور کانوں کے صحیح استعمال کی

زیادہ ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے۔ یعنی صحافی کا مشاہدہ گہرا ہو اور کان تیز ہوں تو فیچر لکھنے کے لیے کئی عنوان مل سکتے ہیں۔ مضامین کی طرح فیچر میں حقائق، تازہ اعداد و شمار اور تحقیقی مواد کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ فیچر ایک ہلکا پھلکا مضمون ہوتا ہے جس میں کسی شے یا فرد یا ادارہ پر ضروری روشنی ڈالی جاتی ہے یا صحافی کے مشاہدات کے اشارے ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فیچر بڑی آسانی سے تحریر ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مضمون لکھنا آسان اور فیچر تیار کرنا دشوار ہے۔ فیچر کی تحریر میں طرزِ نو کی ضرورت ہوتی ہے۔ مضمون میں سنجیدگی کا عنصر ہوتا ہے جب کہ فیچر میں تفریح کی جانب زیادہ میلان ہوتا ہے۔ مضمون میں بھاری بھرکم پن کا لحاظ رکھا جاتا ہے جب کہ فیچر میں بات لطیف مگر چست و چالاک ہوتی ہے۔

مضمون اور فیچر میں بنیادی فرق آمد APPROACH کا ہوتا ہے۔ صحافی کی اہلیت پر فیچر کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ صحافی یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ فلاں عنوان کے ساتھ ایک خصوصی مضمون بہتر رہے گا یا فیچر، کچھ موضوع ایسے ہوتے ہیں جن پر فیچر نہیں لکھا جا سکتا اور کچھ موضوع ایسے ہوتے ہیں جن پر سنجیدہ مضمون کے بجائے فیچر کامیابی سے لکھا جا سکتا ہے اور قارئین سے داد بھی حاصل کی جا سکتی ہے[1]"۔

کوئی مضمون عموماً حقائق کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں کسی سنجیدہ مسئلہ پر بحث ہوتی ہے۔ یا کسی خاص واقعہ کے متعدد پہلوؤں کا جائزہ ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر مضامین حد درجہ رسمی، سنجیدہ اور پُر مغز ہوتے ہیں۔ ہر مضمون میں ایک ابتدا ہوتی ہے، درمیانی مواد ہوتا ہے اور ایک روایتی اختتام۔ فیچر میں بھی ابتدا، درمیان اور اختتام والا مواد موجود رہتا ہے مگر ایک خاص فرق کے ساتھ، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فیچر میں ابتدا ہوتی ہے اور اختتام ہوتا ہے مگر درمیانی مواد غائب رہتا ہے۔ فیچر میں انشا پردازی کے کٹر اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔

---

[1] سید اقبال قادری۔ رہبرِ اخبار نویسی (ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۹۹ء) ص ۲۷۹۔

اختصار فیچر کی رُوح ہے۔ طوالت کسی بھی فیچر کے لیے زہر ہے۔ فیچر جتنا مختصر ہوگا اُتنا ہی دل موہ لینے والا ہوگا۔ فیچر نویسی ہمیشہ طول نویسی اور پُر نویسی کی دُشمن رہی ہے۔ جہاں لفاظی آتی ہے وہاں فیچر کا لطف دھیما پڑ جاتا ہے۔ فیچر میں ایک ہی بات پر توجہ صرف کی جاتی ہے اور ایک ہی خیال کو نکھارا جاتا ہے۔ فیچر کا ایک مزاج ہوتا ہے جس کی کیفیت میں ایک عجیب لطافت کا عنصر زیادہ نمایاں رہتا ہے۔ کسی مضمون میں مختلف کیفیات ہوسکتی ہیں مگر فیچر میں ایک ہی کیفیت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

مضمون معلوماتی ادب کا نمائندہ ہے جب کہ فیچر تفریحی ادب کا علمبردار۔ مضمون محنت سے تو لکھے جاتے ہیں مگر کبھی کبھار مضامین کے مطالعے سے طبیعت میں اُکتاہٹ سی پیدا ہوجاتی ہے۔ فیچر لکھتے وقت اس بات کا خصوصی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ قاری بیزار نہ ہو۔ فیچر کا دل کش، فرحت بخش اور پُر مسرت ہونا لازمی ہے۔ مضمون میں دلائل ہوتے ہیں، صلاح و مشورے ہوتے ہیں، فلسفہ ہوسکتا ہے، نتائج لیے جاتے ہیں، یا فیصلہ کُن اختتام ہوتے ہیں۔ فیچر میں کسی بات کی توصیف بھی ہوسکتی ہے اور کسی بات پر اعتراض بھی ہوسکتا ہے۔ فیچر بہر حال ایک زندہ دلانہ تصنیف ہے[1]"۔

ان دونوں کے فرق کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر بے روزگاری کے مسئلے پر ایک مضمون لکھنا مقصود ہو تو ہمیں سب سے پہلے بے روزگاری کے مسئلے کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے اُن اسباب کو اُبھارنا ہوگا جنھوں نے اسے شدید صورت عطا کردی ہے۔ پھر اُن اقدامات کا محاکمہ کرنا ہوگا جو سرکاری و غیر سرکاری ادارے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اعداد و شمار جمع کر کے یہ بتانا ہوگا کہ پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ بے روزگاروں کے ساتھ ہی ساتھ غیر تعلیم اور غیر تربیت یافتہ بے روزگاروں کی تعداد اس وقت ملک میں اندازاً کتنی ہے تاکہ پوری صورتِ حال واضح ہوجائے۔ لیکن اگر اس موضوع پر فیچر لکھنا مقصود ہو تو فیچر نگار کسی ایک کُنبے کے بے روزگار افراد کو موضوع بنا کر حقیقی صورت حال کو سامنے رکھ دے گا۔ وہ اس طرح بے روزگاری کو بغیر فلسفیانہ صورت دیے اُس کی جیتی جاگتی

[1] سید اقبال قادری۔ رہبر اخبار نویسی (ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۲۷۹۔۲۸۱۔

تصویر آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ اس میں اعداد و شمار کی اگر ضرورت ہو گی بھی تو ان کی حیثیت ضمنی ہی رہے گی۔ یہی نوعیت شواہد کی بھی ہو گی۔

اب آخر میں فیچر کی اقسام کا ذکر کر دینا بھی بے جا نہ ہو گا۔ مثلاً کچھ فیچر ایسے ہو سکتے ہیں جن کا مواد خبروں سے حاصل کیا گیا ہو۔ بسا اوقات خبروں میں ایسا مواد آ جاتا ہے جسے سنجیدہ خبر کی صورت میں پیش کرنے کی بجائے بنا سنوار کر نئے رُوپ میں شائع کرنا زیادہ سود مند ہوتا ہے۔ جس خبر میں تفریحی عنصر کی فراوانی ہو اُسے نیوز فیچر کے لیے منتخب کرنا مناسب ہوتا ہے۔ ایسی خبریں جن میں ایسا مسالہ موجود ہو کہ وہ قارئین کے لیے لطف و انبساط کا موجب ہو سکتی ہوں انھیں فیچر کے لیے منتخب کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ فیچر نگار ایسے موضوعات کو اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کے ذریعے ایسی تخلیقی قوت عطا کرتا ہے کہ اُن کی دل چسپی بدرجہا بڑھ جاتی ہے۔

ایسے نیوز فیچرس کو اخبار میں یا تو جلی حروف میں شائع کیا جاتا ہے یا پھر کسی جگہ چوکھٹا بنا کر شامل کر دیا جاتا ہے تاکہ قارئین کی توجہ فوراً ان پر مرکوز ہو جائے۔

فیچر کی ایک اور قسم کو ہم تاریخی فیچر کے عنوان سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس میں تاریخی مواد کو فیچر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی اہم تاریخی یا قومی تقریب کے موقعے پر بھی ایسے فیچر لکھ کر شائع کیے جاتے ہیں جنھیں عوام بڑی دل چسپی سے پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔

شخصیاتی فیچر، فیچر کی ایک اور اہم قسم ہے جس میں کسی اہم شخص کی زندگی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ان میں قومی، تاریخی، فلمی، سماجی، علمی ہر طرح کی شخصیات آ جاتی ہیں۔

اہم سیاحتی مقامات کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اور انھیں عوام کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے بھی فیچر لکھے جاتے ہیں۔ انھیں سیاحتی فیچر کا نام دیا جاتا ہے۔

کسی پیشے کی تربیت کے سلسلے میں اہم معلومات عوام تک پہنچانے کے لیے بھی فیچر لکھے جاتے ہیں۔ ایسے فیچر کو علمی فیچر کہتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے عوام گھر بیٹھے کسی پیشے یا فن کو سیکھ سکتے ہیں۔ جیسے پتنگ بنانے کا طریقہ، فرنیچر تیار کرنے کا فن وغیرہ۔ انھیں کے ذریعے خواتین کو نئے نئے پکوان تیار کرنے کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔

فیچر کی ایک اور قسم انسانی دل چسپی کے فیچر کے زمرے میں آتی ہے۔ اس میں انسانوں کے

عجیب و غریب کارناموں، حیرت ناک مہموں کا بیان ہوتا ہے جنھیں قارئین بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ کوئی انوکھی روایت یا رسم نظر آئے، اُسے اس کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

ایسے فیچر جن میں دوسروں سے لیے انٹرویوز پیش کیے جائیں انھیں ہم انٹرویو فیچر کے نام سے متصف کرسکتے ہیں۔ یا ایسے فیچر جن میں کسی عصری مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہو اُسے ہم توصیفی فیچر کہہ سکتے ہیں۔

اساطیری فیچرس میں دیوی دیوتاؤں یا مذہبی تہواروں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ تجرباتی فیچروں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اپنے اور دوسروں کے تجربات پر مبنی، لوگوں کے اجتماعی تجربات یعنی جنھیں ہم گروہی تجربات بھی کہہ سکتے ہیں اور لوگوں کے اعترافات پر مبنی تجربات جنھیں اعترافاتی فیچرس کہا جاسکتا ہے۔

اہم جگہوں، پالتو جانوروں، کھیلوں اور سائنسی تجربات کے بارے میں بھی فیچر تیار کیے جاسکتے ہیں۔ مختلف عمر کے لوگوں کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اداروں پر بھی فیچر لکھے جاسکتے ہیں۔ بیانیہ فیچر میں کسی مشاہدے کو پیش کیا جاسکتا ہے جیسے کوئی بصری مشاہدہ یا جنگ کے میدان کا آنکھوں دیکھا حال۔

فیچر کی ایک اہم قسم وہ ہے جس میں تصویروں کی مدد سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسے فوٹو فیچر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں تصویروں کو اس طرح ترتیب دے کر پیش کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود ساری کہانی بیان کرتی ہیں۔ ان میں تحریر کی مدد بہت کم لی جاتی ہے۔ ویسے فیچر نگاری میں فوٹو کی بڑی اہمیت ہے۔ غیر تصویری فیچروں کو بھی تصویروں کی مدد سے زیادہ دل چسپ بنایا جاسکتا ہے۔

اب یہاں یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ امریکہ کی طرح ہمارے ملک میں بھی ایسے ادارے وجود میں آنے لگے ہیں جن کا مقصد اخباروں کو اُجرت پر فیچری مواد فراہم کرنا ہے۔ امریکہ میں ایسے اداروں کو SYNDICATE کہا جاتا ہے جو نہ صرف اخباروں کو فیچر فراہم کرتے ہیں بلکہ اکثر اداریے تک لکھ کر دیتے ہیں۔ یہ ادارے تبصرے، تصاویر، نقشے، جائزے، خصوصی مقالے، معمّے، تفریحی کالم، سیاسی و غیر سیاسی کالم، اسپورٹس خبریں اور رائیں تک فراہم کرکے اخبار کے کام کو آسان بناتے ہیں۔ ایسے ہندوستانی اداروں میں انفا یعنی انڈیا نیوز اینڈ فیچر الائنس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غور کیجئے کہ کیا گذشتہ صفحات میں انہیں نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱- اخباری فیچر کے لفظی معنی خصوصی مقالے کے ہیں۔
۲- یہ ایک ایسا مضمون ہوتا ہے، جس کا تعلق وقت کی کسی اہم ضرورت، واقعے یا حادثے سے ہوتا ہے اور جو مصنف کے نام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔
۳- اخباری فیچر دو اہم کردار ادا کرتا ہے (۱) یہ کسی خبر کو جاذبِ نظر بنا کر قارئین کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے ذوق و شوق سے پڑھیں اور (۲) کسی عصری مسئلے کے بارے میں تفصیل سے معلومات فراہم کرتا ہے۔ بہت سے ایسے پہلو جنھیں خبر کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا انہیں فیچر دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
۴- فیچر محض حقائق کا بیان نہیں ہوتا بل کہ ان سے وابستہ خیالات کی شاعرانہ پیش کش ہوتا ہے تا کہ ان گوشوں کو بھی روشن کیا جا سکے جو سرسری نگاہ ڈالنے سے دکھائی نہیں دیتے۔
۵- فیچر خبر سے کہیں زیادہ متاثر کرتا ہے اُس سے کہیں زیادہ معلومات فراہم کرتا ہے۔
۶- یہ پڑھنے والوں میں تجسس، ہمدردی، شک و شبہے، مزاح، نفرت اور حیرانی ایسی کیفیات پیدا کرتا ہے۔
۷- یہ ایک ایسی تحریر ہوتی ہے جو مسائل کو مطالعے، تحقیق اور انٹرویوز کی مدد سے زیادہ جامع اور واضح بناتی ہے۔
۸- فیچر کو حقائق کی دید و دریافت بھی کہہ سکتے ہیں جس کا مقصد رہبری کرنا، تعلیم دینا اور محظوظ کرنا ہوتا ہے۔
۹- فیچر خبر سے بہت آگے تک سفر کرتا ہے۔ یہ خبر کے دائرے میں وسعت پیدا کر کے اسے نئی جہتیں عطا کرتا ہے۔ یہ خبر کا جائزہ ایک ماہر جراح کی طرح لیتے ہوئے اس کے ایک ایک ریشے کو الگ کر کے دیکھتا ہے۔ اس کا مقصد معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ قارئین کی رگِ تجسس کو بھڑکانا بھی ہوتا ہے۔
۱۰- فیچر ہمیشہ کسی ایسے موضوع پر لکھا جاتا ہے جس میں عوام کو دل چسپی ہو۔
۱۱- فیچر کو موثر بنانے کے لیے تخلیقی زبان برتی جا سکتی ہے لیکن اُسی حد تک کہ وہ سچائی کو دھندلا نہ کر دے۔
۱۲- فیچر نگار فیچر کو رنگین اور کہانی کے اسلوب میں لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو بڑے دل چسپ انداز میں پیش کر سکتا ہے۔

۱۳- فیچر میں عنوان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اُس کا پُرکشش ہونا ضروری ہے۔
۱۴- فیچر کے آغاز میں مرکزی خیال کے ساتھ اُن حدود کے بارے میں معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے اسے لکھنا ہے۔ اس کا آغاز کسی قول، شعر، مکالمے، گفتگو سے ہوسکتا ہے۔
۱۵- اس میں مخففات کے استعمال سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے۔
۱۶- فیچر میں لکھنے والے کا نام درج رہتا ہے۔
۱۷- فیچر کسی بھی صیغۂ فعل میں لکھا جاسکتا ہے۔

## فیچر کی تیاری کے لیے جن امور کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے انھیں مختصراً یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

۱- موضوع مخصوص نوعیت کا ہو۔
۲- مسئلے کے صرف ایک یا دو پہلوؤں پر قلم اٹھایا جائے۔
۳- کسی مخصوص زاویۂ نگاہ کو پیش کیا جائے۔
۴- کسی عصری واقعے سے متعلق ہو۔
۵- ایسی باتیں کہی جائیں جو اب تک نہ کہی گئی ہوں۔
۶- ضرورت پڑنے پر انٹرویوز وغیرہ کی مدد سے فیچر کو دل چسپ بنایا جائے۔
۷- تصویروں کی مدد بھی لی جائے۔
۸- اچھا کاغذ، اچھا ٹائپ اور اچھا عنوان فیچر کو دل چسپ بناتا ہے۔
۹- حجم اخبار کی ضرورت کے مطابق ہو۔
۱۰- فیچر دل کی پیداوار ہوتا ہے اس لیے اس کا اسلوب ہلکا پھلکا اور لطیف ہونا ضروری ہے۔
۱۱- اس کے عناصر ترکیبی میں آغاز، درمیان اور اختتام کی پابندی ضروری نہیں۔ اچانک شروع ہوکر اچانک ختم ہوسکتا ہے۔
۱۲- فیچر اخبار میں یا تو جلی حروف میں شائع کیا جاتا ہے یا پھر کسی جگہ چوکھٹا بنا کر شامل کیا جاتا ہے تاکہ فوراً توجہ کا مرکز بنے۔
۱۳- فیچر کی ایک اور قسم تاریخی فیچر ہے۔ اس میں تاریخی مواد کو فیچر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔
۱۴- اس کی ایک اور قسم شخصیاتی فیچر ہے جس میں کسی اہم شخصیت کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ان

میں قومی، تاریخی، فلمی، سماجی اور علمی ہر طرح کی شخصیات شامل ہیں۔

۱۵- کسی تفریحی مقام یا پیشے کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے بھی فیچر لکھے جاسکتے ہیں۔

۱۶- انسانوں کے حیرت انگیز کارناموں پر بھی فیچر لکھے جاسکتے ہیں۔ کوئی انوکھی روایت یا رسم نظر آئے تو اس پر بھی فیچر لکھا جاسکتا ہے۔

۱۷- انٹرویو فیچر میں ہم دوسروں کے انٹرویوز پیش کرتے ہیں، کسی اہم مسئلے پر بھی فیچر لکھا جاسکتا ہے، اس کو توصیفی فیچر کہتے ہیں۔

۱۸- اساطیری فیچر میں دیوی دیوتاؤں یا مذہبی تہواروں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔

۱۹- تجرباتی فیچروں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) اپنے اور دوسروں کے تجربات پر مبنی (۲) اجتماعی تجربات پر مبنی اور (۳) لوگوں کے اعترافات پر مبنی تجربات جنھیں اعترافاتی فیچر کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

۲۰- اہم جگہوں، پالتو جانوروں، کھیلوں اور سائنسی تجربات پر بھی فیچر تیار کیے جاسکتے ہیں۔ مختلف عمر کے لوگوں کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اداروں پر فیچر لکھے جاسکتے ہیں۔ بیانیہ فیچر میں کسی مشاہدے کو پیش کیا جاسکتا ہے، جیسے جنگ کے میدان کا آنکھوں دیکھا حال۔

۲۱- فیچر کی ایک اہم قسم وہ ہے جس میں تصویروں کے ذریعے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسے فوٹو فیچر کہا جاتا ہے۔ اس میں فوٹوز کو اس ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود ساری کہانی بیان کردیتے ہیں۔

## نمونے کے لیے ایک اہم اخبار سے دو فیچر نقل کیے جاتے ہیں:

### نمونہ ۱

### ہیری کرے گا ڈائنا کے ادھورے کام پورے

برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک اور ممبر نے اپنے بچپن کو چھوڑ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے۔ پرنس آف ویلز چارلس اور پرنس آف ویلز ڈائنا کا چھوٹا بیٹا ہیری پچھلے دنوں اٹھارہ سال کا ہوگیا۔ اس نے اپنا پہلا بڑا انٹرویو تو دیا ہی ساتھ ہی اپنی ماں کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کا بیڑا بھی اٹھانے کا اعلان کیا۔

ڈائنا جسے لوگوں کے دلوں کی ملکہ کہا جاتا تھا، اپنی زندگی میں کئی سماجی خدمات سے وابستہ

رہی۔ اب اس کا لڑکا صحیح معنوں میں دلوں کا شہزادہ بننے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے انٹرویو کے دوران اپنی ماں کو سب سے زیادہ باہمت عورت بتاتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگوں نے اُس کی موت کے بعد بھی اُسے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ خاص طور پر ڈائنا کے باڈی گارڈ کین وہارفے کا ذکر کر رہا تھا۔ اُس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس کے طور پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ڈائنا کلوزلی گارڈ ڈ سیکرٹس۔ اِس نے کہا کہ ڈائنا کی پانچویں برسی اُس ڈھنگ سے نہیں منائی گئی جیسے اس کے مقابلے کی منائی جانی چاہیے تھی۔ اس نے زور دے کر کہا کہ وہ ڈائنا کا بیٹا ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ اُسی کو اپنی پریرنا کا سرچشمہ مانتا ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کا مقصد ڈائنا کے ادھورے چھوڑے گئے کاموں کو پورا کرنا ہی بنانا چاہتا ہے۔ کچھ ماہ پہلے اپنی نشے کی عادتوں کے کارن چرچا میں رہے ہیری نے واضح کیا کہ وہ ایک غلطی تھی۔ میں نے اُس سے سبق سیکھا ہے۔ میں کبھی ویسا بننا نہیں چاہتا تھا۔

وہ گریٹ آرمیڈ سٹریٹ میں واقع لندن ہسپتال میں گیا اور وہاں اس نے بیماریوں سے کچھ جھ گرر ہے بچوں کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ یاد رہے کہ ڈائنا بھی اس ہسپتال کے لیے کام کرتی تھی۔ وہ وہاں اکثر جایا کرتی تھی اور اس کی چیئر مین بھی تھی۔ اپنی موت تک اس نے اس سنستھان کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے کئی کام کیے۔

ہسپتالوں میں کینسر کے مریضوں سے بات چیت کرتے ہوئے اس نے اپنی ماں کی ہی طرح دکھیوں کے چہرے پر مسکان بکھیرنے کی کوشش کی۔ ایک گیارہ سالہ کینسر میں مبتلا بچی سمانتھا کے ساتھ اس نے قریب دس منٹ بات چیت کی اور اس کے بنائے گئے ایک کارڈ کو بھی لیا۔ اِس دوران سمانتھا کی ماں نے ان دونوں کی کچھ تصویریں کھینچیں۔ سمانتھا جو گزشتہ چار ماہ سے کینسر کا علاج کروا رہی ہے، نے کہا ''میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں پرنس ہیری سے ملوں گی اور اُس سے باتیں بھی کروں گی''۔

ہیری نے ہسپتال میں بچوں اور گردے کے امراض میں مبتلا لوگوں سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ ان بچوں کی بہادری کا قائل ہو گیا ہے جو زندگی کی مشکلات کا سامنا مسکرا کر کرتے ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ ہیری کی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنے جنم دن پر اس ہسپتال میں جائے جس سے اس کی ماں کو اتنا پیار تھا۔ ہسپتال میں کینسر کی مریض سمانتھا سے بات کرتے ہوئے ہسپتال کے ایک عہدیدار نے ہیری کو ڈائنا کی کچھ یادگار تصویروں کا البم پیش کیا۔ اسی دن ہیری نے تین دوسرے چیریٹی اداروں کے پروگراموں میں بھی حصہ لیا۔ شاہی خاندان کے ممبر کے طور پر

ہیری کے اکیلے کسی پروگرام میں شامل ہونے کا اس کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے ہر جگہ ایک ہی بات دُہرائی کہ وہ اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سماج کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اپنا جنم دن منانے کا ایک دوسرا طریقہ جو ہیری نے چُنا وہ اپنی ماں کے پسندیدہ فوٹو گرافر ماریو تستنو سے فوٹو سیشن کروانا۔ اس کے مطابق سیشن کے دوران ان دونوں نے خوب لطف اُٹھایا۔ اپنے شرارتی انداز میں اس نے کہا کہ اس کا بڑا بھائی ولیم اس بات سے خوب حسد کرے گا جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ فوٹو دیکھتے ہی اس کا پہلا ردِ عمل کیا تھا۔ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا ''میں نے سوچا کہ اتنا اچھا نظر آنے والا نوجوان کون تھا؟''

یقیناً یہ حیرانی والی بات تھی کہ پارٹیوں کے شوقین اپنا اٹھارواں جنم چپ چاپ گھر پر یا چیریٹی اداروں میں گزارنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کے دل میں ماں کے خوابوں کو پورا کرنے کی بڑی تمنا پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے کہا یوں تو میں ہمیشہ ہی غریبوں کے لیے کام کرنا چاہتا تھا لیکن ماں کی موت کے بعد میری یہ خواہش اور بڑھی۔ پہلے وہ جب کسی چیریٹی پروگرام میں حصہ لیتا تھا تو اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ خود ہی پوری خود اعتمادی دکھانا چاہتا تھا۔

اپنی مشکل کے بارے میں ہیری کا کہنا تھا کہ ابھی اس نے اپنی ای لیول پڑھائی کا آخری سال پورا کرنا ہے۔ پھر کچھ عرصہ تک بریک لے کر آئندہ تعلیم پر غور کرے گا۔ ہیری کا کھیلوں سے بھی لگاؤ ہے۔ وہ ساکر، پولو اور گولف کا شوقین ہے۔ اپنے جنم دن پر اس نے اینٹن پریڈنڈ (ورلڈ کپ ڈیفنڈر ریو کا بھائی) کی گول کیپنگ کو مات دیتے ہوئے زوردار گول کر کے واہ واہ بھی لوٹی۔ اسے ایک ٹی شرٹ بھی پیش کی گئی جس پر پوری انگلینڈ ٹیم کے دستخط تھے۔ اس کی پیٹھ پر ہیری اور اس کے نیچے 18 لکھا تھا۔ اس نے مانا کہ وہ آگے بھی کھیلا کرے گا لیکن پیشہ وارانہ طور پر نہیں بلکہ چیریٹی میچوں میں (سیپا)۔

## دیش کے لیے نہیں، پیسوں کے لیے کھیلتے ہیں

میڈیا کا کیا کرایا:

بین الاقوامی کرکٹ پریشد، بھارتیہ کرکٹ بورڈ اور کھلاڑی اسٹار کرکٹروں کے درمیان جھگڑا فی الحال کچھ دنوں کے لیے سلجھ گیا ہے۔ مگر پچھلے کچھ ہفتوں میں میڈیا نے جس طرح شور مچایا اس سے ایک بات واضح ہوئی ہے کہ بھارتیہ پرچار میڈیا کا کرکٹ کے علاوہ کسی اور کھیل سے تعلق نہیں۔

دراصل کرکٹ پریشد، بورڈ اور کھلاڑیوں کے درمیان چل رہا چوہے بلّی کا کھیل صرف پیسے اور بس پیسے کے لیے تھا۔ کرکٹ پریشد کسی بھی طرح کا موٹا ہاتھ مارنا چاہتی تھی۔ تو بورڈ کا ارادہ بھی نیک نہیں تھا۔ وہ بھی ہر حالت میں کمائی کا بڑا حصّہ ہڑپ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رہی کھلاڑیوں کی بات تو انھوں نے دکھا دیا کہ ان کے لیے کرکٹ صرف لاکھوں کروڑوں بنانے والا کھیل ہے۔ ایک دھندہ ہے، جس کی آڑ میں لاکھوں کروڑوں کرکٹ پریمیوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور ان کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ دیش بھگتی کا سہارا اور رنگے کی شان ان کے لیے جذباتی کھلواڑ کا صرف بہانہ ہے۔

قابلِ تعریف یہ بات ہے کہ اس دیش کے لوگ کرکٹ اور کرکٹروں میں ناپاک ارادوں کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی ان کی پوجا ارچنا میں لگے رہتے ہیں۔ بدلے میں کرکٹر انھیں کیا دے رہے ہیں، کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

ٹریجڈی دیکھو کہ اس دیش کے باقی کھیل پیسے پیسے کو محتاج ہیں۔ انھیں کوئی اسپانسر منہ نہیں لگاتا۔ دوسری طرف کرکٹ کے پیچھے چھوٹی بڑی دیشی اور بدیشی کمپنیاں آنکھیں بند کر کے دوڑ لگا رہی ہیں۔ ایک سودیشی ہونے کا ڈھونگ کرنے والی بھارتی کمپنی تو کرکٹروں پر خاصی مہربان ہے۔ جنتا کی خون پسینے کی کمائی لوٹنے والی کمپنیاں کرکٹ پر جم کے لٹا رہی ہیں۔ مگر جن کھیلوں میں سودیشی اور بھارتیتا نظر آتی ہے اُن کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں ہے۔ کیوں کہ پورا دیش کرکٹ کی وجہ سے جھلا ہو رہا ہے۔ اس لیے سوچنے سمجھنے کی طاقت کھو چکے ہیں۔ ہمارے نیتا ایم. پی اور مہینہ دانا طبقے کے لوگ کرکٹ پر اس طرح لٹو ہیں کہ انھیں اس بات کا احساس نہیں کہ کرکٹ کی آڑ میں بے شمار بدیشی کمپنیوں نے بھارتیہ بازار کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اسٹار کرکٹروں کی طرف سے دیکھ کر عام بھارتیہ بھی اپنی روزمرہ کی استعمال کی چیزوں کا چناؤ کرنے لگا ہے۔ نتیجہ کے طور پر بھارتیہ پراڈکٹ پرتی یوگتا کے دور میں اوندھے منہ گر رہے ہیں

افسوس ناک بات یہ ہے کہ سرکار، سرکاری مشنری اور ذمّے دار لوگوں کا اس طرف بالکل دھیان نہیں ہے، انھیں اپنے کھلاڑیوں کی طرف سے بنائے جا رہے ریکارڈوں پر بدھائی دینے سے ہی فرصت نہیں ہے۔ وہ اتنے نادان ہیں کہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہماری کرکٹ ٹیم کا شمار دنیا کی سب سے پھسڈّی ٹیموں میں کیا جاتا ہے۔ وہاں پیسے کمانے میں ہمارے کرکٹر دوسرے ممالک کے مقابلے میں کہیں آگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کرکٹ پریشد کی شرطیں پوری کرنے

میں بھارتیہ کرکٹر سب سے پیچھے رہے۔ دنیا کے دوسرے کرکٹ ممالک میں ایسا پاگل پن نہیں ہے۔ کرکٹروں کی مالی حالت بہت خراب ہے۔ وجہ، وہاں کی سرکاروں کا دماغ خراب نہیں اور عام شہری بھی دماغی طور پر زیادہ تندرست ہے۔ نتیجہ کے طور پر ان ممالک کے نوجوان اتھلیٹک، باسکٹ بال، جمناسٹک، فٹ بال، ہاکی، تیراکی جیسے ہر دل عزیز کھیلوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

کرکٹ کو جنم دینے والے انگلینڈ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں بھی کرکٹ کی حالت بے حد قابلِ رحم ہے۔ دوسرے دیش بھی اس کھیل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے پیسوں اور روپے ڈالروں کے لیے ہائے ہائے مچانے والے کرکٹروں کو پرماتما کی طرح پوجا جارہا ہے۔

بے شک بڑا گناہگار میڈیا ہے خصوصاً الیکٹرانک میڈیا نے تو حد ہی کردی۔ ٹی.وی نے کرکٹ اور کرکٹروں کو نائک اور مہانائک بنایا تو باقی کی کسر نئے نئے گناہگار پوری کررہے ہیں۔ انھیں کرکٹروں کو اسپانسر کرنے والی کمپنیاں تھوڑی بہت چھوٹ دے دیتی ہیں۔ بدلے میں بھارت اور عام بھارتی کو کرکٹ چاٹنے کو مل رہی ہے جسے کوئی چٹخارے لے لے کر چاٹ رہا ہے۔ اسے کیا پتا کہ کرکٹ کا زہر اندر ہی اندر پورے دیش کو کھوکھلا کر رہا ہے۔

## دھن راج کی حصول یابی سچن سے کم نہیں

جس وقت کرکٹ میں تنازعہ چھایا ہوا تھا اسی دوران جرمنی میں چیمپینز ٹرافی ہاکی کے میچ بھی کھیلے جارہے تھے۔ چیمپینز ٹرافی میں دنیا کے وہ بڑے ممالک ہاکی کھیلتے ہیں جن میں بھارت کی حصہ داری ہاکی پریمیوں کے لیے بڑی بات کہی جاسکتی ہے۔ اور ٹیموں میں بھارت کو چوتھا مقام حاصل ہوا۔ چیمپینز ٹرافی میں حصہ لینے کے لیے بھارت کو لمبا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ چیمپینز چیلنج کپ جیتنے کے بعد ہی بھارت کو موقع مل سکا۔ مگر کرکٹ کی چیمپینز ٹرافی کے لیے بھی کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کرکٹروں کو اپنے مفادات کی وجہ سے آئی سی سی اور بھارتیہ بورڈ سے جوجھنا پڑا۔ ان کا داخلہ پہلے سے ہی طے تھا کیوں کہ صرف دس دیش ہی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ جن میں اپنا نمبر ساتواں ہے مگر ہاکی پچاس دیش کھیلتے ہیں۔ اور چیمپینز ہاکی کے نتیجوں پر نظر ڈالیں تو بھارت کا مقام چوتھا ہوا۔ یہ مظاہرہ برا نہیں کہا جاسکتا مگر کرکٹ کے دیوانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھیں تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ جب ہمارا ٹاپ کرکٹر سچن اپنا سواں ٹسٹ میچ کھیل رہا تھا، دھن راج پلّے دیش کے لیے تین سو پچاسواں میچ کھیل چکا

تھا۔ مگر سچن کو پرچار میڈیا نے سجا کر رکھ دیا اسے بھگوان، بھارت کی شان اور پتا نہیں کیا کیا خطابات دیے گئے۔ مگر انگلینڈ کے خلاف سیریز میں اس نے کون سا تیر چلا دیا؟ اپنے سوویں ٹسٹ میں تو بالکل کورا ثابت ہوا۔ راہل دراوڑ اور مائیکل وان نے اس کی فضیلت کا دیوالہ نکال دیا پھر ایک بھی ٹی۔ وی چینل پورے پانچ دن تک سچن کا رونا روتا رہا ہے۔ دوسری طرف دھن راج کو چیمپینز ٹرافی کا افضل ترین کھلاڑی کہا گیا۔ دھن راج کی اس حصول یابی کے سامنے سچن کہیں بھی نہیں ٹکتا مگر بدقسمتی اس دیش اور اس دیش کے قومی کھیل ہاکی کی۔ کرکٹ کو بلاوجہ سر چڑھایا جا رہا ہے اور سچن کا بھتیجہ فٹ بال کھیلنے کے لیے اترا تو اسے ہیرو بنا دیا۔ بھتیجہ کی ٹیم دس گولوں سے ہاری مگر پرچار میڈیا نے اس کے اسکول اور بھتیجے کو اس لیے جم کر اچھالا کیوں کہ بھتیجے کے نام کے ساتھ تیندولکر جڑا ہے۔ بگڑی اور اوچھی پتر کاری کی ایسی کوئی مثال شاید ہی ملے۔

## صرف پیسے کا کھیل

پچھلے کچھ سالوں سے عام بھارتیہ کھلاڑی کرکٹ کی تانا شاہی اور گھٹیا پن کو برداشت کرتا آرہا ہے مگر اب حالات بدل رہے ہیں۔ اب کھیلوں کے ساتھ جڑے کھلاڑی بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ دیش کے اندر جو کچھ چل رہا ہے ٹھیک نہیں ہے عام طور پر دوسرے کھیلوں سے وابستہ مقابلتاً باضابطہ اور شانت ہوتے ہیں وجہ کئی سالوں کی محنت کے بعد کسی نشانے تک پہنچتے ہیں۔ کسی نوآموز کرکٹر کی طرح راتوں رات ہیرو نہیں بن جاتے۔

بدلتے سلسلۂ واقعات سے کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کے درمیان ٹکراؤ کا خدشہ لگاتار زور پکڑتا جا رہا ہے۔ کرکٹ کو نہ تو اولمپک کھیل اور نہ ہی ایشیائی کھیلوں میں مقام ملا ہے۔ پیسہ اور صرف پیسہ ہی کرکٹ کا واحد مقصد ہے جسے حاصل کرنے کے لیے کرکٹ کھلاڑی کہیں تک بھی اتر سکتے ہیں۔ میچ فکسنگ کانڈ میں سزا یافتہ اور لے دے کے بے گناہ سرٹیفکٹ حاصل کرنے والوں نے پیسے کی طرز بتا دی ہے۔

حالیہ جھگڑا بے شک آئی سی سی بورڈ اور کھلاڑیوں کے درمیان تھا مگر اصولی طور پر پیسہ ہی جھگڑے کی جڑ تھا۔ جو لوگ جھگڑا سلجھنے کو کرکٹ کی جیت بتا رہے ہیں انھیں کون سمجھائے کہ جیت پیسے کی ہوئی ہے۔

1970 کے دہائی سے پہلے کے کسی بھی کرکٹر کو پوچھ لو وہ بتا دے گا کہ آج کرکٹ کے معنی کس

طرح بدل چکے ہیں۔ مہذب لوگوں کا کھیل تو یہ رہا ہی نہیں۔ یہ تو بس پیسے کا کھیل ہے اور روپے ڈالروں کے لیے کرکٹ، کرکٹر اور اس کے مہارتھی کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اوپر پیش کیا گیا پہلا فیچر انگلستان کے شاہی خاندان کی مشہور زمانہ بہو یعنی پرنس آف ویلز چارلس کی بیوی پرنس آف ویلز ڈائنا کے بیٹے ہیری سے تعلق رکھتا ہے۔ ہیری نے اٹھارہ سال کا ہو جانے پر اعلان کیا کہ وہ اپنی والدہ کے ادھورے کاموں کو پورا کرے گا اور اس سلسلے میں اس نے اپنا جنم دن اس لندن ہسپتال میں گزارا جس کی چیئر پرسن اُس کی والدہ تھی اور جس کے لیے اس کی والدہ نے بہت سے کام کیے تھے۔ اس فیچر کا جائزہ لینے پر اس کی جو خصوصیات سامنے آکر اسے ایک اچھا فیچر بناتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱- اس کا عنوان فیچر کے تقاضوں کے عین مطابق بڑا دل چسپ ہے۔ جس کو پڑھتے ہی قاری کی توجہ پرنس ڈائنا کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ جس کی المیاتی موت پر ساری دنیا نے عجیب عجیب کہانیاں سنی تھیں۔

۲- فیچر کی دوسری اہم ضرورت اس کے موضوع کا کسی اہم واقعہ پر مبنی ہونا ہے۔ یہاں بھی اہم واقعہ یہ ہے کہ پرنس ہیری اٹھارہ سال کی عمر پانے کے بعد اپنے جنم دن پر یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے ادھورے کاموں کو پورا کرے گا اور وہ اس کا آغاز بھی اُس دن اُس ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ دن گزار کے کر دیتا ہے جن کی خدمت اس کی والدہ اکثر کیا کرتی تھی۔ وہ اس ہسپتال کی چیئر پرسن بھی تھی۔

۳- ہیری کے اس اعلان سے قارئین کے دل میں اس کے بارے میں مزید جاننے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ چناں چہ فیچر نگار اس تجسس کی تشفی کے لیے ہیری کے بارے میں کچھ باتیں بتاتا ہے۔ مثلاً ایک یہ کہ اُسے شراب پینے کی جو لت پڑی تھی اُسے اُس نے چھوڑ کے، یہ نیا عہد کیا ہے کہ اب وہ اپنی والدہ کے ادھورے کام مکمل کرے گا۔

۴- فیچر نگار نے فیچر کو دل چسپ بنانے کے لیے دو تصویروں کو بھی استعمال کیا ہے۔ ایک تصویر میں ہیری کو اُس کی والدہ نے گود میں اٹھا رکھا ہے اور معصوم ہیری کسی طرف اشارہ کر رہا ہے، جس کی طرف اس کی والدہ بھی دیکھ رہی ہے اور دوسری تصویر میں نوجوان ہیری ہسپتال میں کینسر کی ایک مریض سمانتھا کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔

۵- فیچر نگار نے اس تحریر کو جامع بنانے کے لیے انٹرویو کو بھی برتتا ہے۔ اس انٹرویو کے ذریعے ہیری اپنے نئے منصوبے کا بھی اعلان کرتا ہے۔

۶- فیچر کو مزید دل چسپ بنانے کے لیے مصنف نے ہیری کی اُس دن کی دوسری سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہیری نے اُس دن اس طرح کے تین دوسرے چیریٹی اداروں کے پروگراموں میں بھی حصّہ لیا۔

۷- فیچر نگار نے فیچر کو دل چسپ اور جامع و مانع بنانے کے لیے ہیری کی ملاقات اُس کی والدہ کے پسندیدہ فوٹو گرافر سے کرا کے دونوں کی گفتگو کا ایک چھوٹا سا حصّہ بھی پیش کیا ہے۔

۸- پارٹیوں کے شوقین ہیری میں یہ تبدیلی کس طرح رونما ہوئی اس کا پتا تو نہیں چلتا۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کا خیال اُس کے ذہن میں تین سال پہلے پیدا ہوا تھا جب وہ ابھی پندرہ برس کا تھا۔

۹- قارئین کے تجسس کو مزید بڑھانے کے لیے مصنف نے یہ بھی بتایا کہ اسپتال کے ایک عہدیدار نے اُسے ایک فوٹو البم بھی پیش کیا جس میں اس کی والدہ کی کچھ تصویریں تھیں جو اس کی زندگی کے دوران لی گئی تھیں۔

۱۰- فیچر نگار نے ہیری کی دل چسپیوں کے کچھ اور پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً وہ اپنی اے۔لیول کی پڑھائی کا آخری سال مکمل کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے بریک لگا کر فیصلہ کرے گا کہ اُسے آگے کیا کرنا ہے۔ ساتھ ہی کھیلوں سے اس کے لگاؤ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اب وہ پیشہ وارانہ طور پر نہیں بلکہ شوقیہ طور پر کھیلے گا، اس کا بھی فیچر سے ہمیں پتا چلتا ہے۔

مندرجہ بالا فیچر اگر شخصیاتی فیچر کے زمرے میں آتا ہے تو درج ذیل فیچر کا تعلق کھیلوں سے ہے خصوصاً I.C.C کے کھلاڑیوں سے جھگڑے کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کرکٹ کے کھلاڑی یہ کھیل صرف روپیہ کمانے کے لیے کھیلتے ہیں۔ یہ فیچر بھی اس کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرتا ہے۔

۱- اس کا عنوان ''دیش کے لیے نہیں پیسوں کے لیے کھیلتے ہیں'' بہت ہی دل چسپ ہے اور ہمیں فوراً ہی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

۲- مصنف نے بین الاقوامی کرکٹ پریشد بھارتیہ کرکٹ بورڈ اور اسٹار کرکٹروں کی نیت پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جھگڑا صرف پیسے کا تھا۔

۳- فیچر کو جامع و مانع بنانے کے لیے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کرکٹ کو اگرچہ اولمپک میں جگہ نہیں

دی گئی ہے اس کے باوجود اس کے کھلاڑیوں کو اولمپک میں کھیلنے والے کھلاڑیوں سے کہیں زیادہ روپیہ ملتا ہے جب کہ ان کھلاڑیوں کو تھوڑے پر ہی ٹرخا دیا جاتا ہے۔

۴- کرکٹ کے کھلاڑی عوام کے جذبات کا استحصال کرتے ہیں۔ دیش بھگتی صرف بہانہ ہے۔ عوام اُن کے ناپاک ارادوں کو جانتے ہوئے بھی ان کی پوجا کرتے ہیں۔

۵- ثبوت فراہم کرنے کے لیے تیندولکر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی انگلینڈ کے خلاف مایوس کُن کارکردگی کے باوجود میڈیا نے اس کے نام کو خوب اچھالا۔ اس کے مقابلے میں دھن راج کی کارکردگی کو نظر انداز کیا گیا جب کہ وہ کسی طرح تیندولکر سے کم نہیں کھیلا۔

۶- مصنف نے میڈیا کے کردار کو بھی صحیح قرار نہ دیتے ہوئے اُسے خوب لتاڑا ہے۔ اس کے خیال میں میڈیا نے بھارتیہ ٹیم کو پھسڈی ہونے کے باوجود اول درجے کی ٹیم بنا دیا ہے۔

۷- فیچر نگار نے فیچر کو دل چسپ بنانے کے لیے تحقیق کر کے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ تیندولکر کے بھتیجے کے راتوں رات اسٹار فٹ بال پلیر بن جانے کا ذکر اسی مقصد کے تحت کیا گیا ہے۔

۸- آخر میں یہ بھی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آئی.سی.سی. بورڈ اور کرکٹروں کا جھگڑا اور کچھ نہیں صرف پیسے کا جھگڑا تھا۔ پھر یہ بھی کہا ہے کہ بھارتی کرکٹر پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں جس میں میچ فکسنگ بھی شامل ہے۔

۹- دل چسپی بڑھانے کے لیے مصنف نے ایک کارٹون کا سہارا بھی لیا ہے جس میں ایک طرف ترنگا لہرا رہا ہے اور دوسری طرف جھنڈے پر تین قسم کے کرنسی نوٹ لہرا رہے ہیں جن میں سے ایک پر ڈالر کا نشان بنا ہے، دوسرے پر پونڈ کا اور تیسرے پر ایک لاکھ کے ہندسے درج ہیں۔ بیچ میں کرکٹ کا کھلاڑی ایک ہاتھ میں بیٹ لیے دوسرے ہاتھ سے کرنسی نوٹوں والے جھنڈے کو سلامی دے رہا ہے۔ آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکان رقصاں ہے۔

۱۰- زبان سیدھی سادی لیکن طنز کی کاٹ لیے ہوئے ہے۔

**مشق:**

۱- اپنے علاقے کی کسی اہم شخصیت پر ایک فیچر تحریر کیجیے

۲- تصویری فیچر کا کوئی نمونہ پیش کیجیے۔

# اخباری انٹرویو

انٹرویو کے لفظی، اصطلاحی دونوں معنی ملاقات کے ہیں۔ اخباری ملاقات محض خیر و عافیت دریافت کرنے کی غرض سے نہیں کی جاتی۔ اس کے کچھ اہم مقاصد ہوتے ہیں جن کا براہِ راست تعلق صحافت سے ہوتا ہے۔ ملاقات کے انھیں مقاصد سے وہ اقسام جنم لیتی ہیں جن میں ملاقات کو اکثر تقسیم کیا جاتا ہے۔

یوں تو صحافتی ملاقات کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن اکثر ماہرینِ صحافت نے انھیں تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً ملاقات کا ایک مقصد کسی خبر کے بارے میں مستند معلومات جمع کرنا ہو سکتا ہے۔ یعنی اُن حقائق تک رسائی حاصل کرنا جن کا بنیادی تعلق کسی خبر سے ہو۔ ایسے خبری حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کیے جانے والے انٹرویو کو خبری ملاقات یا انٹرویو برائے حقائق (نیوز انٹرویو) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

خبری ملاقات کا مقصد جیسا کہ اوپر کہا گیا خبروں میں آنے والے کسی اہم موضوع سے متعلق کسی ماہر کی رائے کو خاص و عام تک پہنچانا ہوتا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے خبر سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً ایک حادثے کی صورت میں نامہ نگار یا صحافی زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جنھوں نے واقعے یا حادثے کو ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو یعنی جو واقعے یا حادثے کے عینی شاہد ہوں۔

اسی طرح اگر خبر کا تعلق کسی ادارے کے قیام سے ہے تو ملاقات کے دوران اخبار نویس یا ملاقات کرنے والا یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ ادارے کی نوعیت کیا ہے اُس کا عوام کو کیا فائدہ ہوگا، قوم و ملک کی آمدنی میں کتنا اضافہ ہونے کے امکانات ہیں۔ کون سرمایہ لگا رہا ہے۔ ادارے کا تعلق اگر کسی صنعت سے ہے تو ادارے کے قیام کی جگہ کیا اُس کے لیے سود مند ہے۔ کیا وہاں سے مال لانا یا لے جانا آسان ہوگا۔ وہ پُل یا سڑک سے کتنا دور ہے۔ کتنے لوگوں کو روزگار حاصل ہوگا۔ اور وہاں محنت کرنے والوں کی محنت کے نکاس کی کیا صورت ہوگی۔

کہیں اس ادارے کے قیام سے ماحول پر برا اثر تو نہیں پڑے گا۔ پانی اور ہوا کدر تو نہیں ہو گی۔ کھیتی باڑی کو نقصان تو نہ پہنچے گا۔ نئے لوگوں کی آمد کی وجہ سے علاقے میں جرائم کی شرح میں اضافہ تو نہ ہو گا۔ قیمتیں تو نہ بڑھیں گی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب پہلوؤں سے متعلق انٹرویو کرنے والا معلومات جمع کر کے عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ معلومات کسی ایک شخص سے حاصل نہیں ہو سکتیں اس لیے وہ کئی لوگوں سے ملاقات کر کے اُن سے گفتگو کرتا ہے۔ اس سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ادارے کے منیجر، علاقے کے میئر یا میونسپلٹی کے چیئرمین، بنکوں کے اراکین، عمارت بنانے والے ٹھیکیدار وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ اس لیے وہ ان سب حضرات سے ملاقات کر کے معلومات حاصل کرتا ہے۔ اگر مواد اطمینان بخش ہے تو وہ اس موضوع پر خبر شائع کرنے کی بجائے ایک خبری فیچر ترتیب دے گا اور تصویروں، خاکوں اور گوشواروں کی مدد سے اُسے زیادہ سے زیادہ وقیع بنانے کی کوشش کرے گا۔

اس طرح مختلف لوگوں سے ملاقات کرنے سے صحافی کو بہت سی ایسی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں جن میں عوام کی گہری دل چسپی ہو۔ کسی مسئلے کے بہت سے ایسے پہلوؤں پر اُن کی آرا کے ذریعے روشنی پڑ سکتی ہے جو اب تک سب کی نظروں سے مخفی رہے ہوں۔ اس طرح متعلقہ موضوع روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتا ہے جس سے اس کے وزن و وقار میں بے پناہ اضافے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس سے اُس خبر کو صحیح طور پر سمجھنے میں عوام کو آسانی ہوتی ہے۔

اخباری ملاقات کی اس قسم سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب سید اقبال قادری "انٹرویو برائے حقائق" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> "جب صحافی جائے واردات پر موجود نہیں ہوتا تو جیسے ہی وہاں پہنچتا ہے دیگر چشم دید گواہوں سے ناطہ جوڑ لیتا ہے۔ وہ تیز رفتاری سے یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ تصدیق کی نیت سے وہ دو چار مختلف لوگوں سے کم و بیش ایک ہی طرح کے سوالات کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ صحافی اُن تمام افراد کے ناموں اور پتہ جات سے واقف ہو جن سے وہ معلومات جمع کر رہا ہے۔ وہ ایسے افراد سے اُن کے نام شائع کرنے کی رسمی اجازت بھی طلب

کر سکتا ہے۔ اگر وہ لوگ اپنی شناخت اخبار میں دینا پسند نہ کریں تو نامہ نگار اشارتاً "ایک چشم دید گواہ کا کہنا ہے......" جیسے فقرے لکھ کر کام چلا لیتا ہے...... جہاں کہیں کوئی حادثہ یا سنگین واقعہ ہوتا ہے بھیڑ جمع ہوتی ہے مگر جلد بکھر جاتی ہے۔ ایسے حالات میں صحیح قسم کے گواہوں کو ڈھونڈ نکالنا صحافی کے لیے مشکل کام ہے مگر اُسے ہمت نہیں ہارنی چاہیے...... کسی بھی متنازعہ معاملے پر مختلف بیانات حاصل کرنے کے لیے فریقین سے ملنا ضروری ہے"[1]۔

ملاقات کا دوسرا مقصد کسی خاص موضوع کے بارے میں عوام کی آرا معلوم کرنا ہوتا ہے تاکہ اُس کی روشنی میں آگے کے طریقۂ کار کو طے کیا جاسکے۔ اسے ملاقات برائے رائے بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹی.وی سے تعلق رکھنے والے لوگ اکثر کسی اہم مسئلے سے متعلق مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کر کے اُن کی آرا ریکارڈ کرتے نظر آتے ہیں۔ ملاقات کی اس قسم کو (Symposium Interview) سمپوزیم انٹرویو کا نام دیا جاتا ہے۔

اجتماعی یا گروہی ملاقات (Symposium Interview) میں کسی مسئلے کے بارے میں معلومات صرف اُنھیں حضرات سے حاصل نہیں کی جاتیں جن کا تعلق کسی مسئلے سے ہو بلکہ اُن سے بھی ملاقات کی جاتی ہے جن کا متعلقہ مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مثلاً اگر مسئلے کا تعلق کسی حادثے سے ہے تو نہ صرف اُس حادثے کے چشم دید گواہوں سے ملاقات کر کے اُن کے خیالات محفوظ کیے جائیں گے بلکہ دوسرے لوگ جن کا اُس حادثے سے کوئی تعلق نہ ہو، سے بھی ملاقات کر کے اُن کی آرا محفوظ کی جاسکتی ہیں۔

گروہی ملاقات کے لیے اشخاص کا انتخاب متعلقہ موضوع پر اُن کی ماہرانہ قدرت یا گہرے رشتے کی وجہ سے نہیں کیا جاتا بلکہ عام شہریوں میں سے کیا جاتا ہے تاکہ متعلقہ موضوع کے بارے میں اُن کی رائے معلوم کی جاسکے۔ اس میں عوام کی رائے کا احترام سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ کتنے لوگوں سے ملاقات کرنا ہے یہ پہلے سے طے نہیں کیا گیا ہوتا۔ البتہ کہانی سے یہ پتا چلنا چاہیے کہ خاصی تعداد میں لوگوں سے ملاقات کر کے اُن کی آرا جمع کی گئیں۔ سب سے ایک ہی طرح کے سوالات کا پوچھا جانا بھی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ سوالات میں ایک

---

[1] رہبر اخبار نویسی۔ ص ۳۵۷-۳۵۸۔

ہی قسم کے الفاظ کا استعمال بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی کسی خاص موضوع سے متعلق آرا معلوم ہو جاتی ہیں جو قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث ہوتی ہیں۔

انٹرویو کی تیسری اور اہم قسم شخصی ملاقات ہے۔ اس میں کسی اہم شخصیت سے ملاقات کر کے اُن کے افکار و نظریات کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی زندگی بھر کے تجربات کو بھی محفوظ کر کے خاص و عام تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ دیکھنے یا سننے والوں کی رشد و ہدایت کا موجب ہو۔

شخصی ملاقات کا مقصد کسی شخصیت یا جس سے ملاقات کی جا رہی ہے اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اِسے شخصیت کا انکشاف کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ سوانحی خاکے سے مختلف ہوتا ہے۔ سوانحی خاکے میں متعلقہ شخص کے بارے میں ساری تفصیلات جمع کی جاتی ہیں۔ یعنی اس کا سنہ پیدائش، مقامِ پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی بیاہ، بچے، اہم کارنامے اور کامیابیاں وغیرہ۔ اگر وہ کوئی اعلا عہدے دار ہے تو وہ کس طرح وہاں تک پہنچا وغیرہ۔

شخصی ملاقات کے لیے ملاقات کرنے والا ایک ایسے مرد یا خاتون کا انتخاب کرتا ہے جس کی شخصیت اس قابل ہو کہ اُسے خبر کا موضوع بنایا جا سکے۔ یعنی اُس کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی ایسے عناصر ہونا ضروری ہیں جن میں قارئین دل چسپی لے سکتے ہیں۔ ان عناصر میں شخصیت کا تیکھا پن، کوئی انوکھی عادت یا کوئی قابلِ توجہ عنصر ہونا ضروری ہے۔ مثلاً کسی بزدل کا تیس مار خان، یا کسی بھکاری کا لکھ پتی بن جانا یقیناً ایسے حقائق ہیں جن سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا عوام پسند کر سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب اقبال قادری لکھتے ہیں:

> "بعض اوقات ایسے اشخاص یکایک شہرت حاصل کر لیتے ہیں جن کے بارے میں عوام کو پہلے سے کچھ معلوم نہیں رہتا۔ ایسے خوش نصیب جو اتفاقاً یا اچانک راتوں رات مشہور اور مقبول ہو جاتے ہیں جو اب تک گمنام تھے موقع کی مناسبت سے قارئین اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات جاننے کے مشتاق ہو جاتے ہیں۔ کوئی اہم چوٹی سر کرنے والے، مہم باز، کرکٹ کھلاڑی، نوبل انعام یافتہ، فوجی

بغاوت کے فوراً بعد برسرِ اقتدار آنے والے سربراہ حکومت وغیرہ اچانک عوام کے سامنے آتے ہیں اور اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیل حاصل کرنا صحافی کا فرض ہو جاتا ہے"۔[1]

شخصی ملاقات کی روداد میں قارئین بڑی دل چسپی لیتے ہیں اس لیے اسے بڑی ہوشیاری سے ترتیب دینا چاہیے۔

انٹرویو لینا ایک اہم فن ہے۔ اس کے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں جنھیں ملحوظ رکھے بغیر اس ہفت خوان کو احسن طریقے سے سر نہیں کیا جاسکتا۔ انٹرویو لیتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ملاحظہ کیجیے:

چرچل نے ایک بار کہا تھا کہ سب سے بہتر تقریر وہ ہوتی ہے جسے سب سے زیادہ محنت کے ساتھ تیار کیا گیا ہو۔ اسی طرح سب سے اچھا انٹرویو وہی قرار دیا جاسکتا ہے جسے لینے سے پہلے انٹرویو لینے والے نے اچھی طرح تیاری کی ہو۔ اُسے اپنے موضوع سے پوری واقفیت ہونا ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس شخص کا انٹرویو لینے والا ہے۔ اس شخص کا تعلق جس میدان سے ہے اُس سے پوری واقفیت ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اگر وہ کرکٹ کے کسی کھلاڑی کا انٹرویو لینے والا ہے تو اسے کرکٹ کے کھیل سے پوری واقفیت حاصل کر لینا چاہیے۔ کرکٹ کے کھیل کے اصولوں کو جاننا بہت ضروری ہے چاہے اس کے لیے کسی لائبریری کی کتابوں کو ہی کیوں نہ کھنگالنا پڑے۔

انٹرویو چوں کہ بالمشافہ بات چیت کا عمل ہے اس لیے جس شخص کا انٹرویو لیا جارہا ہے اس سے قربت پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ اُسے اُس کی عمر، عادات اور اس کی دل چسپیوں کا پورا پورا علم ہونا چاہیے۔ یہ معلومات مذکورہ شخصیت کے رشتے داروں یا دوستوں سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اُن لوگوں سے اخذ کی جاسکتی ہیں جن کے درمیان وہ اٹھتا بیٹھتا یا کام کرتا ہے۔

انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے متذکرہ شخص سے مل کر یا ٹیلی فون کے ذریعے یہ طے کر لیا جائے کہ موصوف کب انٹرویو دینا چاہتے ہیں۔ اگر ہو سکے تو موصوف کو یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ اس مقصد کے لیے کتنا وقت لینا چاہتے ہیں۔ انٹرویو کی تاریخ، وقت اور مقام طے کرتے وقت موصوف کی سہولت کا خیال رکھیے۔ انٹرویو کسی ایسی جگہ لینا ضروری ہے

---

[1] رہبر اخبار نویسی۔ ص ۳۶۲۔

جہاں اس میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال نہ ہو۔ یعنی نہ کوئی شور و شر ہو اور نہ کسی کی دخل اندازی کا امکان۔ یہ بھی طے کر لیجیے کہ آپ انٹرویو تنہا لینا چاہتے ہیں یا کسی دوسرے کی موجودگی میں۔ لوگ عام طور پر کسی دوسرے کے سامنے نہیں کھلتے۔ دوسرے شخص کی موجودگی کی ضرورت اُسی صورت میں ہو جاتی ہے جب اس کا احتمال ہو کہ انٹرویو دینے والا بعد میں مکر سکتا ہے۔

انٹرویو سے پہلے ایسے سوالات تیار کر لینا بھی ضروری ہیں جن سے متذکرہ شخصیت کے سارے پہلو سامنے آنا یقینی ہوں۔ سوال ایسے بھی نہ ہونے چاہئیں کہ جو تضیع اوقات کا موجب ہوں۔

انٹرویو لینے والے کو نہ تو باتونی ہونا چاہیے اور نہ اُسے متذکرہ شخصیت پر حاوی ہونے کی کوشش ہی کرنا چاہیے۔ اُسے ایک اچھا سامع ہونا چاہیے۔ مناسب سوال پوچھ کر اس کو آگے بڑھانا ہی اس کا مقصد اور فرض ہوتا ہے۔

متذکرہ شخصیت کے عادات و اطوار، گفتگو کرنے کا انداز سب کچھ انٹرویو میں بیان ہونا ضروری ہے۔

بسا اوقات متذکرہ شخصیت یا تو جان بوجھ کر غلط معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے یا پھر یادداشت کی کمزوری اور معلومات کی کمی کی وجہ سے ایسا سہواً ہو جاتا ہے۔ انٹرویو لینے والے صحافی یا نامہ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر خاصا محتاط رہے۔

خبری انٹرویو میں زیادہ زور اِس بات پر ہوتا ہے کہ متذکرہ شخصیت کیا کہہ رہی ہے۔ شخصی انٹرویو میں اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کس طرح گفتگو کرتا ہے اس کی بھی اہمیت ہے۔ یعنی کیا کہنے کے ساتھ ہی ساتھ وہ کس طرح کہتا ہے اس کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرنا ضروری ہے۔

انٹرویو کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ گفتگو کا پورا پورا ریکارڈ مرتب کرنے کی کوشش کرے۔ بہتر یہ ہے کہ بات چیت کرتے وقت وہ اہم نکات کو لکھ لے اور اُس کے جن سوالات کی اہمیت زیادہ ہے اُن کے جوابات کو لفظ بہ لفظ لکھ کر محفوظ کر لے تاکہ بعد میں شائع کرتے وقت غلط بیانی کا احتمال نہ ہو۔ انگریزی میں تو یہ کام شارٹ ہینڈ کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ اردو والوں کو اس سلسلے میں کوئی اپنا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا تاکہ گفتگو کے

دوران ہی نوٹس لیے جاسکیں۔

انٹرویو کا مقصد چوں کہ کسی شخصیت کا انکشاف ہے اس لیے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ کسی سوال کی وجہ سے متذکرہ شخصیت کو ناراض نہ کیا جائے نہ کوئی ایسی بات کی جائے جس سے موصوف کی طبیعت کے مکدّر ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے الفاظ یا جملے استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے موصوف کے کسی طرح کے جذباتی صدمے سے دوچار ہونے کا امکان ہو۔

اسی طرح انٹرویو دیتے وقت ایسے نکات جنھیں صرف انٹرویو لینے والے کو پس منظر کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے ظاہر کیا گیا ہو اور جنھیں شائع نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہو، انھیں شاملِ اشاعت نہ کرنا چاہیے۔ انٹرویو کے دوران متعلقہ شخصیت پر یہ بات واضح کر دی جانی چاہیے کہ انٹرویو کا مقصد قارئین کو اُن کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرنا ہے۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کریں گے اُسے بے کم و کاست شائع کر دیا جائے گا اور یہ بھی کہ انٹرویو کے دوران بیان کی گئی اکثر باتوں کو شائع نہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔

اگر نوٹس حاصل کرنے میں دقت کا سامنا ہو تو اس مقصد کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اسے موصوف کی مرضی اور علم کے بغیر ہرگز استعمال میں نہ لانا چاہیے۔ ٹیپ ریکارڈ کے استعمال کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ نقصان یہ ہے کہ ٹیپ ریکارڈ سے کہانی تیار کرنے کے لیے ٹیپ کو بار بار آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ ٹیپ کیے گئے انٹرویو سے موصوف انکار نہیں کر سکتے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ نوٹس بھی لیے جائیں اور ٹیپ بھی کیا جائے۔ لیکن ٹیپ کو محض نوٹس کی صحت درست کرنے کے لیے ہی برتا جائے۔

مخصوص حالات میں انٹرویو کا مسودہ موصوف کو دکھایا بھی جاسکتا ہے۔ اگر یہ بات پہلے سے موصوف کو بتا دی جائے تو موصوف سے بڑی بے فکری اور آزادی سے سوالات کے جواب مل سکتے ہیں۔ اس سے ایک تو غلط بیانی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں دوسرے اگر کہیں کوئی غلطی ہوئی بھی ہو تو اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ طریقہ اُس وقت برتا جانا چاہیے جب اس بات کا پورا یقین ہو کہ مسودہ جلد واپس مل جائے گا۔ اگر دیر کا اندیشہ ہو تو اس تکلف کو آزمانے سے احتراز کرنا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ دیر ہو جانے سے انٹرویو کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔

انٹرویو شروع کرنے سے پہلے ایسا بے تکلفانہ ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس میں موصوف بڑی بے فکری سے انٹرویو دے سکیں۔ ایسے تکلفات میں نہ پڑنا چاہیے جو خواہ مخواہ تضیع اوقات کا باعث ہوں۔ اسی طرح اگر موصوف کسی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں تو اُس وقت غیر ضروری بحث و مباحثے سے احتراز کرنا چاہیے۔

انٹرویو لینے والے صحافی میں صبر و تحمل کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ فرض کرلیجیے اُسے انٹرویو کے لیے وقت ملنے میں دیر ہوئی ہے یا انٹرویو دینے والا شخص وقت رہنے کے باوجود انٹرویو نہیں دیتا تو صحافی کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ اُسے صبر و تحمل سے سب کچھ برداشت کرنا چاہیے کیوں کہ اُس کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

انٹرویو لینے والے صحافی کو بڑے ادب و احترام کے ساتھ موصوف سے وہ معلومات حاصل کرنی چاہئیں جن کے لیے اُس نے موصوف کو زحمت دی ہے۔ اُسے غیر ضروری موضوعات کو چھیڑ کر اصل موضوعات سے ہٹ جانے سے ایسا نقصان ہوتا ہے جو اُس کی ساری محنت کو ضائع کردیتا ہے۔ اُسے نہ اپنا وقت ضائع کرنا چاہیے اور نہ موصوف کا۔

## انٹرویو کی روداد تحریر کرنے کا فن

کسی اہم شخصیت سے ملاقات کرکے اس کا انٹرویو لینا تو ایک فن ہے ہی اس کی روداد تحریر کرنا بھی ایک اہم فن ہے اور اس مقصد کو نامہ نگار یا صحافی اُس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ اس فن میں تھوڑی بہت سدھ بدھ نہ رکھتا ہو۔ یہ کام بھی اُسی نامہ نگار یا صحافی کو انجام دینا پڑتا ہے جس نے انٹرویو لیا ہو کیوں کہ وہی شخص اُس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکتا ہے جس نے اُس سے پہلے ملاقات کرکے گفتگو کی ہو۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ انٹرویو تو کوئی لے اور اس کا تحریری مسودہ کوئی اور تیار کرے۔

خبر کی تحریر کی طرح انٹرویو کے مسودے کی تیاری کے بھی کچھ فنی تقاضے ہیں جن کا لحاظ رکھے بغیر اُس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ خبر کے اسلوب کے عین مطابق اسے بھی کچھ حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ کچھ بڑے بڑے حصے یوں ہیں:

۱- ابتدائیہ یا آغاز۔

۲- گفتگو۔

۳- اختتامیہ۔

یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ خبر تحریر کرتے وقت اُس کے ابتدائی حصے کی بڑی اہمیت ہے جسے صحافتی زبان میں ابتدائیہ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انٹرویو کے مسودے میں بھی ابتدائیے کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ابتداہی کمزور ہویاوہ غیر واضح اور مبہم ہو تو قاری شروع کرتے ہی اس سے بیزار ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس سے استفادہ کرنے کا حوصلہ ہی وہ خود میں پیدا نہ کرپائے گا۔ انٹرویو کا ابتدائی حصہ اگر تخلیقی ہو تو یہ سب سے بہتر ہے۔ جو بات انٹرویو میں سب سے اہم اور ضروری ہو اُس کو اوّلین پیراگراف کا موضوع بنایا جانا چاہیے۔ بعض دفعہ انٹرویو کی روداد سوال و جواب کی صورت میں تحریر کردی جاتی ہے جس سے اُس میں مواد تو زیادہ سے زیادہ کھپ جاتا ہے پَر وہ قاری کی دل چسپی کو برقرار نہیں رکھ پاتی۔ تحریر کرنے والے کی قلم میں اگر جان ہے تو وہ ابتدائیہ کے ذریعہ ہی قارئین کی توجہ کو حاصل کرلیتا ہے۔

انٹرویو کا مسودہ تحریر کرتے وقت سوالات کی ایسی شکل یا ساخت دینے سے پرہیز کرنا چاہیے جو عام طور پر استعمال کی جاتی ہے اور کثیرالاستعمال ہونے کی وجہ سے گھِسی پِٹی اور بے اثر قرار پاچکی ہے۔ مثلاً ”میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا۔ یا میرے پوچھنے پر انھوں نے اظہار خیال کیا“۔ وغیرہ وغیرہ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ سوالات میں ندرت اور اُن کے جوابات میں بے ساختگی اور لطافت پیدا کرنے سے تحریر میں وہ جان پیدا ہو جاتی ہے جو قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

ویسے تو انٹرویو کے مسودے کو کس طرح تحریر کیا جائے اس کے کوئی قطعی ضابطے تو نہیں ہیں پر اتنا ضرور ہے کہ نامہ نگار یا صحافی کا موئے قلم اگر اُس میں فنی شعور ہے تو ایسا جادو جگا سکتا ہے اور ڈارون کی کتاب تنازع البقا کی طرح اُس میں وہ ادبی شان پیدا کر سکتا ہے کہ قارئین سر دُھنتے ہی رہ جائیں۔ تاہم اس بات کا زیادہ تر انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ انٹرویو کس مقصد سے حاصل کیا جارہا ہے۔ یعنی اگر انٹرویو کسی وقتی مسئلے کی وجہ سے لیا جارہا ہے تو پھر انٹرویو لیتے وقت اُسی مسئلے سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو مرکوز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر انٹرویو کسی بڑی شخصیت کے دن کے سلسلے میں لیا جارہا ہے تو پھر بجائے اس کے کہ اُس شخص کی شخصیت کو اُبھارا جائے جس کا انٹرویو لے کر کسی بڑی شخصیت کے کارناموں پر روشنی ڈالی

جاری ہے بہتر یہی ہو گا کہ زیرِ بحث شخصیت پر توجہ دی جائے۔ یعنی اگر ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بارے میں کسی ایسے شخص سے انٹرویو لیا جارہا ہے جو اُن کے ساتھ رہا ہے، تو یہاں ساتھ رہنے والے شخص کی شخصیت کو پسِ پردہ رکھ کر رادھا کرشنن کے بارے میں معلومات اس کے ذریعے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی

اسی طرح اگر کسی سیاسی شخصیت کا انٹرویو الیکشن کے نتائج کے سلسلے میں لیا جارہا ہے تو پھر انٹرویو دینے والے کے الیکشن سے متعلق تاثرات کو ہی اُبھارنے کی کوشش کی جائے اور کسی ایسے مسئلے کو زیرِ بحث نہ لایا جائے جس کا الیکشن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن اگر انٹرویو کا مقصد اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہے تو پھر اُن تمام پہلوؤں کے بارے میں سوالات کیے جائیں گے جن سے وہ شخصیت عبارت ہے۔ پھر اس کا خیال رکھنا بھی ضروری ہو گا کہ ایسے براہِ راست سوال نہ کیے جائیں جو ماضی سے تعلق رکھتے ہوں۔ یعنی یہاں سوالات ایسے ہونے چاہئیں جو:

۱- حال سے ماضی کی طرف سفر کر کے پھر حال پر آن کر ختم ہوں۔ اور

۲- جن سے حال اور ماضی کے تقابل کے زیادہ پہلو روشن ہوتے ہوں۔

مثلاً براہِ راست اس طرح کا سوال کرنے کے کہ جناب آپ کچھ اپنے بچپن کے بارے میں ہمارے ناظرین یا قارئین کو بتائیں، سوال یوں پوچھنا چاہیے کہ جناب آج کل بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف والدین بہت زیادہ دھیان دیتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں۔ کیا آپ کے بچپن میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی؟ یعنی یادوں کے سہارے قارئین کو بھی ذرا اس دور کی جھلکیاں دکھا دیجیے۔ یا ایک نجی سوال اس طرح سے بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ "صاحب مشہور قول ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے "کیا آپ کی شخصیت کے پیچھے بھی ایسا ہی کوئی ہاتھ ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہو تو کچھ اُن کے بارے میں بھی ہمارے قارئین کو بتانے کی زحمت گوارہ کریں۔

یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ انٹرویو میں بھی ابتدائیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ خاص طور سے اگر انٹرویو کسی پوری شخصیت سے متعلق ہو تو پھر ابتدائیہ کو چند تعارفی جملوں کے بعد شخصیت کے مرکزی پہلو پر آکر ٹک جانا چاہیے اور وہیں سے آغاز کرنا چاہیے تاکہ چھوٹتے ہی قاری کو روشنیوں کے ایسے دائرے میں قید کر دیا جائے کہ وہ مسرت و بصیرت دونوں کے مزے

لوٹے۔ انٹرویو کے دو مثالی نمونے نیچے درج کیے جا رہے ہیں تا کہ قاری کو سمجھنے میں آسانی رہے کہ ابتدائیہ کس نوعیت کا ہونا چاہیے۔

مثال (۱)۔ فرض کر لیجیے کہ یومِ اقبالؔ یعنی علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے موقعے پر منائے جانے والے یومِ اقبال کے سلسلے میں ایک ایسی شخصیت کا انٹرویو چھاپنا مقصود ہے۔ جس کا علامہ سے دو اعتبار سے قریبی رشتہ ہے (۱) یہ کہ موصوف نے علامہ اقبال کو دیکھا ہے اور اُس زمانے میں اُن کی عمر اتنی ضرور تھی کہ وہ تاثرات کو محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اور (۲) آپ نے اقبال سے فطری لگاؤ کے اعتبار سے خود بھی اُن کی شخصیت اور فن پر خاصا کام کیا ہے۔ اب یہاں پر ابتدائیہ تحریر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ اس طرح کا ہو کہ علامہ اقبال کے ساتھ ہی ساتھ موصوف کی شخصیت کا بھی ایک خاکہ قاری کے ذہن میں ابتدا ہی سے ابھر آئے۔ نیچے اب اسی کے سلسلے کا ایک ابتدائیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن اس شعر کی تخلیق کے وقت شاید انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن اُن کے اسی شعر کو لوگ انھیں کی بوقلموں شخصیت کے اعتراف کے طور پر استعمال کریں گے اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنے گل ہائے عقیدت نچھاور کیا کریں گے۔ دنیا کا یہ روشن ستارہ آج سے ۵۰/۶۰ برس قبل آج ہی کے دن اردو زبان و ادب کے افق پر رونما ہوا تھا۔ اُس وقت کسے معلوم تھا کہ اس ستارے کی تابانی اردو دنیا کو ابدالآباد تک کے لیے وہ روشنی عطا کر دے گی جس کی چمک کبھی ماند نہ ہو گی۔ اردو کے اس مہر منوّر سے نہ جانے کیسے کیسے ذرّے شہاب بن کر چمکے ہیں۔ آج ہم ایسے ہی شہاب سے گفتگو کر رہے ہیں جنھوں نے نہ صرف علامہ اقبالؔ کو دیکھا ہے بلکہ ان کی شخصیت و فن پر خود بھی بڑے مثبت انداز میں کام کیا ہے۔ یہ ہیں "اقبال اور کشمیر"، "اقبال مائنڈ اور آرٹ" اور "رودادِ اقبال" کے مصنف پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ آئیے سب سے پہلے ہم انھیں سے جاننے کی کوشش کریں کہ ماہر اقبالیات کی جس مسندِ فضیلت پر وہ آج براجمان ہیں اُس منزل کی طرف قدم بڑھانے کی ترغیب انھیں کس نے دی۔ یعنی اقبالؔ سے اُن کے اس معنوی رشتے کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا۔

قارئین کرام آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اوپر کے اقتباس میں شروع سے لے کر اس مقام تک کہ جہاں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نام آیا ہے سارا حصہ ابتدائیہ ہے۔ اس طرح کے انٹرویو کا ابتدائیہ اگر اس سے بہتر نہ ہو سکے تو کم سے کم اس طرح کا تو ہونا ہی چاہیے۔

مثال (۲)۔ فرض کیجیے کہ مسودے کا تعلق کسی شخصی انٹرویو سے ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ اب کسی ایک حوالے سے انٹرویو نہیں کرنا ہے بلکہ پوری شخصیت کے بارے میں قارئین کو معلومات فراہم کرنی ہیں۔ پھر اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ یہ تحریر گھسی پٹی نہ ہو۔ یعنی انٹرویو کا جو عام طریقہ استعمال کیا جاتا ہے ویسا ہی اسلوب بیان یہاں بھی نہ برتا جائے۔ یعنی اس طرح سے شروع نہ کیا جائے۔

> "آج ہم اپنے قارئین کو ایک ایسی شخصیت سے متعارف کرا رہے ہیں جس نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ عوام کی خدمت میں صرف کیا ہے"۔

اس طرح کے آغاز کو انگریزی میں Steriotype کہا جاتا ہے۔

اس کے بجائے اگر آغاز یوں ہو تو دلچسپی میں اضافہ ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

> "جس طرح عظمت کی کوئی بندھی ٹکی تعریف نہیں کی جا سکتی اسی طرح عظمت کا کوئی بندھا ٹکا پیمانہ بھی تیار نہیں کیا جا سکتا۔ عظمت ایک ایسا جوہر ہے جو مٹی میں بھی اگر چھپا ہوا ہو تو کوندنے لگتا ہے۔ چیتھڑوں میں بھی ملبوس ہو تو پنجہ مہر کی طرح چاروں اور نور کے ہالے سے بنتا چلا جاتا ہے۔ ایسی مقناطیسی شخصیت سے کون ملنا نہ چاہے گا۔ کون نہ چاہے گا کہ اُسے ایسے برگد کی چھانو میں بیٹھنا نصیب ہو جس نے سالہا سال تک تھکے ماندے قافلوں کو فرحت عطا کی ہو۔ انھیں سکون و طمانیت کی دولت سے فیض یاب کیا ہو۔ دکھوں کی ماری ہوئی اس دنیا میں دم بھر کے لیے سستانے اور تازہ دم ہونے کا یارا عطا کیا ہو۔ دین و دنیا دونوں حاصل کرنے کی تمنا اگر آپ کے دل میں بھی گدگدا رہی ہو تو دم بھر کے لیے اس برگد کے سائے میں ضرور آپ بیٹھیں۔ یہ برگد ہے وہ برگزیدہ ہستی جسے ساری دنیا مدر ٹریسا کے نام سے منسوب کرتی ہے"۔

انٹرویو کے مسودے کے دوسرے حصے کا نام "گفتگو" ہے۔ اس میں نامہ نگار کبھی تو سوالات کے ذریعے اور کبھی سوالات کے بغیر اپنی شخصیت (جس سے انٹرویو لیا جارہا ہے) کو بات کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ تاکہ وہ کھل کر سامنے آجائے اور اس کے ان پہلوؤں تک قارئین کی رسائی ہو جائے جو اب تک اُن کی نظر سے مخفی رہے ہیں۔ تاہم سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ متعلقہ شخصیت کے جو پہلو سب سے اہم ہیں اُن کے بارے میں پہلے سوالات پوچھے جائیں۔ جو ضمنی نوعیت کے ہیں اُن کے بارے میں بعد میں۔ مثلاً اگر کوئی شخص شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو تو سب سے پہلے اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے۔ مثلاً صاحب آپ نے شعری اُفق پر جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کا اعتراف برصغیر ہندوپاک میں ہی نہیں بیرونی دنیا نے بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے میں چاہوں گا کہ آپ ہمارے قارئین کو ان محرکات کے بارے میں کچھ بتائیں جنھوں نے آپ کو اس راہِ پُر خار کی طرف راغب کیا! اور آسانی کے لیے انٹرویو کے اس حصے یعنی گفتگو کا آغاز اس طرح کے گھسے پٹے سوال سے نہ کیا جائے۔

"آپ سب سے پہلے ہمارے قارئین کو اپنی پیدائش، والدین، وطن کے بارے میں بتائیں"۔

انٹرویو کے اس حصے میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ نامہ نگار نہ تو موضوع پر موصوف سے بحث میں اُلجھے اور نہ اس کی کسی بات کو جھٹلانے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر دورانِ گفتگو موصوف سے کسی تاریخی واقعے سے متعلق سہو سرزد ہو تو اس کی بروقت اصلاح کردے تاکہ قاری کسی طرح کی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ خود کم سے کم بولے، موصوف کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دے۔ گفتگو کے دوران موصوف کو ٹوکنے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے موصوف اپنے لب و لہجے میں پوری روانی سے اظہارِ خیال کرتا ہے جس سے نامہ نگار کو اُس کے اسلوب کو گرفت میں لانے کا موقع ملتا ہے۔

انٹرویو تحریر کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ موصوف نے جس طرح سے خیالات کا اظہار کیا ہے اُسے اُسی طرح رقم کردیا جائے تاکہ قاری کو نہ صرف معلومات حاصل ہوں بلکہ وہ اس کے اسلوب سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ جس کے بغیر کسی شخصیت کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر گفتگو کسی دوسری زبان میں ہو رہی ہے جس میں انٹرویو شائع نہیں کیا جانا ہے تو اس وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل کی روح کو برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ یہ تسلیم کہ ترجمے میں وہ بات پیدا کرنا بہت

مشکل ہے پرنا ممکن نہیں۔ کوئی بھی ایسا ترجمہ جس میں اصل کی روح خبط ہو جائے انٹرویو کی ضرورتوں کے منافی ہے۔ اس لیے ایسے ترجموں کو شائع نہیں کرنا چاہیے۔

انٹرویو صرف آمنے سامنے بیٹھ کر نہیں کیا جاتا۔ بسا اوقات یہ کام ٹیلی فون یا خط و کتابت کے ذریعے بھی انجام دیا جاتا ہے۔ اگر انٹرویو ٹیلی فون پر لیا گیا ہو تو بہتر یہ ہوتا ہے کہ اسے لکھنے کے ساتھ ہی ساتھ ٹیپ بھی کر لیا جائے تاکہ تحریر کے وقت آسانی رہے۔ اس کی تحریر کے لیے بھی انھیں اصولوں کو برتنا ضروری ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ البتہ اگر انٹرویو خط و کتابت کے ذریعے سوالنامہ بھیج کر لیا گیا ہے تو پھر نامہ نگار کے لیے آسانی یہ ہے کہ اُسے اس صورت میں صرف ابتدائیہ اور اختتامیہ ہی تحریر کرنا ہوتا ہے۔ گفتگو کے حصے وہ انھیں جوابات سے نقل کر دیتا ہے جو اس کے سوالنامے کے جواب میں موصول ہوئے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں دقت یہ ہوتی ہے کہ پہلی دو صورتوں میں ضمنی وضاحتیں حاصل کر کے اُسے جو آسانی میسر ہوتی ہے اس کا یہاں فقدان ہوتا ہے۔ اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ وضاحت کے لیے الگ سے سوال بنا کر روانہ کرے اور جب تک وہ نہ کہے انٹرویو شائع نہ کرے۔ انٹرویو اکثر و بیشتر کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہوتے ہیں اس لیے وہاں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ انٹرویو کی اشاعت کے لیے مہینوں انتظار کیا جائے۔

انٹرویو کا آخری حصہ اختتامیہ ہوتا ہے اس کا مقصد ٹی. وی یا ریڈیو کے انٹرویو کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ آخر میں اُن نتائج کو پیش کر دے جو پوری بحث کے دوران ابھرے ہیں اور مذکورہ شخصیت اور سننے والوں کا شکریہ ادا کر کے انٹرویو کے ختم ہونے کا اعلان کر دے بلکہ یہاں اُسے کسی ایسے نکتے پر ختم کرنا ضروری ہے کہ قاری غزل کے کسی اچھے مطلع کی طرح اُسے یاد رکھیں۔ اس میں اختصار ہونا بہت ضروری ہے۔

انٹرویو اگر کسی ہنگامی موضوع پر ہے تو پھر بہتر ہے کہ اس کا اختتام آخری سوال کے جواب پر ہی کر دیا جائے۔ اس کے بعد نامہ نگار اپنی طرف سے نہ تو انٹرویو کے بارے میں تبصرہ کرے نہ مزید تعریف و توصیف سے کام لے۔

اگر انٹرویو کا تعلق کسی شخصیت کی زندگی بھر کی خدمات کا اعتراف ہے تو پھر انٹرویو کے دوران کیے آخری سوال کے بعد ایک مختصر سا پیرا بڑھا دیا جائے جس میں متعلقہ شخصیت کے اُن پہلوؤں کا ذکر کر دیا جائے جن پر ابھی کھُل کر بات نہیں کی جا سکی ہے اور کسی اگلے شمارے میں ان کو سمیٹنے کا وعدہ کرتے ہوئے پیرے کو ختم کرے۔

غور کیجئے کہ کیا گذشتہ صفحات میں انہیں نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱- انٹرویو کے لفظی اور اصطلاحی دونوں معنی ملاقات کے ہیں۔

۲- صحافتی ملاقات کی تین قسمیں ہیں: (۱) خبری ملاقات (نیوز انٹرویو) دوسرے الفاظ میں اسے انٹرویو برائے حقائق بھی کہہ سکتے ہیں، (۲) ملاقات برائے رائے (Symposium Interview) سمپوزیم انٹرویو)، (۳) شخصی ملاقات۔

۳- خبری ملاقات کا مقصد خبروں میں آنے والے کسی اہم موضوع سے متعلق کسی ماہر کی رائے کو خاص و عام تک پہنچانا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک حادثے کی صورت میں نامہ نگار یا صحافی زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، جنھوں نے واقعے یا حادثے کو ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

۴- خبر سے متعلق اگر مناسب مواد جمع ہو جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ نامہ نگار اسے خبر کی صورت میں ہی شائع کرے وہ اس مواد سے ایک خبری فیچر بھی شائع کر سکتا ہے۔ اس میں حاصل ہوئی معلومات کو تصویروں، خاکوں اور گوشواروں کی مدد سے زیادہ وقیع بنایا جاسکتا ہے۔

۵- ملاقات برائے رائے (سمپوزیم انٹرویو) کا مقصد کسی خاص موضوع سے متعلق عوام کی رائے جاننا ہوتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں آگے کے طریقۂ کار کا تعین عمل میں آسکے۔ اس کے دوران معلومات صرف انہی لوگوں سے حاصل نہیں کی جاتیں جن کا تعلق مسئلے سے ہو بلکہ ان سے بھی ملاقات کی جاتی ہے جن کا متعلقہ مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس ملاقات کے لیے متعلقہ موضوع پر ماہرانہ قدرت ہونا بھی ضروری نہیں، ہر خاص و عام سے متعلقہ موضوع کے بارے میں رائے لی جاتی ہے۔ البتہ سب کے لیے ایک ہی طرح کے سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔ بلکہ ایک ہی طرح کے الفاظ بھی استعمال کیے جانے ضروری ہیں۔

۶- شخصی ملاقات میں کسی اہم شخصیت سے ملاقات کر کے اس کے افکار و نظریات اور زندگی بھر کے تجربات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ اسے شخصیت کا انکشاف کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ سوانحی خاکے سے مختلف ہوتا ہے۔ سوانحی خاکے میں متعلقہ شخص کے بارے میں ساری تفصیلات جمع کی جاتی ہیں جب کہ شخصی ملاقات کے دوران صرف چیدہ پہلو ہی سامنے لائے جاتے ہیں۔ البتہ شخصیت ایسی ہونی چاہیے جس میں قارئین کی دل چسپی کے سامان موجود ہوں۔ ان عناصر میں شخصیت کا شکی پن، کوئی انوکھی عادت یا قابل توجہ عنصر وغیرہ مثلاً کسی بزدل کا تیس مار خاں بن جانا، یا کسی بھکاری کا لکھ پتی بن جانا وغیرہ یہ ایسے حقائق ہیں جن کے بارے میں عوام مزید جاننے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔

۷- سب سے اچھا انٹرویو وہی ہوتا ہے جسے لینے سے پہلے اچھی تیاری کر لی گئی ہو۔ اسے اپنے موضوع سے پوری واقفیت ہونا چاہیے مثلاً اگر کرکٹ کے کسی کھلاڑی کا انٹرویو لینا مقصود ہو تو انٹرویو لینے والے کو کھیل سے پوری واقفیت ہونا چاہیے۔

۸- انٹرویو چوں کہ بالمشافہ بات چیت کا عمل ہے اس لیے جس شخص کا انٹرویو لیا جارہا ہے اس سے قربت ہونا بھی ضروری ہے یعنی اس کی ساری عادات یا دل چسپیوں کا علم ہونا چاہیے۔

۹- انٹرویو کا وقت پہلے سے مل کر یا ٹیلی فون وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے طے کر لینا ضروری ہے۔ ایسا کرتے ہوئے جس سے ملاقات کرنا ہے اس کی سہولت کا خیال رکھا جائے۔

۱۰- انٹرویو کسی ایسی جگہ لینا ضروری ہے جہاں اس میں رکاوٹ پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

۱۱- یہ بھی طے کر لیجیے کہ آپ انٹرویو تنہا لینا چاہتے ہیں یا کسی دوسرے کی موجودگی میں۔ لوگ عام طور پر کسی دوسرے کے سامنے نہیں کھلتے۔

۱۲- انٹرویو سے پہلے ایسے سوالات تیار کر لینے چاہییں جن سے متذکرہ شخصیت کے سارے پہلو سامنے آسکتے ہوں۔

۱۳- انٹرویو لینے والا باتونی نہ ہونا چاہیے۔ اُسے ایک اچھا سامع ہونا چاہیے۔

۱۴- متذکرہ شخصیت کے عادات واطوار، گفتگو کرنے کا انداز سب کچھ انٹرویو میں بیان ہونا چاہیے۔

۱۵- انٹرویو لیتے وقت خاصا محتاط رہنا ضروری ہے تاکہ انٹرویو دینے والے کی غلط بیانیوں کو پکڑا جاسکے۔

۱۶- خبری انٹرویو میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ متذکرہ شخصیت کیا کہہ رہی ہے، شخصی انٹرویو میں اس کے ساتھ ساتھ وہ کس طرح کہتا ہے اس کی معلومات فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۷- انٹرویو کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ گفتگو کا پورا پورا ریکارڈ مرتب کرنے کی کوشش کرے۔ جن سوالات کی اہمیت زیادہ ہو اُن کے جوابات لفظ بہ لفظ لکھ لیے جائیں تاکہ بعد میں شائع کرتے وقت غلط بیانی کا احتمال نہ ہو اردو والے یہ کام ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے کرسکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر ریکارڈ کردہ بیان سے پھر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ نوٹس بھی لیے جائیں اور ٹیپ بھی کیا جائے۔

۱۸- شخصی انٹرویو کا مقصد چوں کہ شخصیت کا انکشاف ہے اس لیے خیال رکھا جائے کہ کوئی ایسا سوال نہ کیا جائے جس سے متذکرہ شخصیت کی طبیعت مکدر ہو جائے۔

۱۹- جن باتوں کو شائع نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہو انھیں شائع نہ کیا جانا چاہیے۔

۲۰- انٹرویو کا مسودہ شائع کرنے سے پہلے متعلقہ شخصیت کو دکھا دینا چاہیے۔ اگر یہ بات پہلے بتادی جائے تو سوالات کے جواب آزادی سے مل سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس سے دیر ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسا نہ کیا جائے۔ دیر ہونے سے انٹرویو کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

۲۱- جو کچھ بیان کیا گیا ہو اسے بے کم و کاست شائع کر دینا چاہیے۔

۲۲- انٹرویو لینے والے صحافی میں صبر وتحمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔ انٹرویو کا وقت ملنے میں اگر دیر ہوئی ہے یا انٹرویو دینے والا شخص وقت نہیں دیتا تو ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے صبر وتحمل سے سب کچھ برداشت کرنا چاہیے، اس کی کامیابی کا

راز اسی میں مضمر ہے۔

۲۳- صحافی کو بڑے ادب و احترام سے صرف ان ہی موضوعات پر گفتگو کرنا چاہیے جس کے لیے موصوف کو زحمت دی گئی ہو۔ غیر ضروری موضوعات کو چھیڑ کر اپنا اور موصوف کا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔

## ملاقات کے عناصر ترکیبی

۱- انٹرویو کا مسودہ اسی کو تیار کرنا چاہیے جس نے انٹرویو لیا ہو، ایسا نہ کرنا چاہیے کہ انٹرویو تو کوئی اور لے اور مسودہ کوئی اور تیار کرے۔

۲- انٹرویو کی تحریر کے بھی کچھ فنی تقاضے ہیں۔ اُسے بھی کچھ حصوں میں تقسیم کر کے تحریر کرنا پڑتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(الف) آغاز یا ابتدائیہ

(ب) گفتگو

(ج) اختتامیہ

۳- انٹرویو کے مسودے میں بھی آغاز کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اگر تخلیقی ہو تو بہتر ہے۔

۴- انٹرویو میں جو بات سب سے اہم ہو اسے اوّلین پیراگراف میں پیش کرنا چاہیے۔

۵- انٹرویو کے مسودے میں سوال و جواب کی نوعیت وہ نہ ہونی چاہیے جو اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً ''میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا یا میرے پوچھنے پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا وغیرہ وغیرہ'' سوالات میں ندرت اور ان کے جوابات میں بے ساختگی اور لطافت پیدا کرنے سے تحریر میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔

۶- انٹرویو کی ساخت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس مقصد سے لیا جا رہا ہے۔ اگر انٹرویو کسی وقتی مسئلے کی وجہ سے لیا جا رہا ہے تو پھر اسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو مرکوز رکھنی چاہیے۔ یعنی اگر ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بارے میں ان کے کسی

ساتھی سے انٹرویو لے رہے ہیں تو بات ساتھی کے بارے میں نہیں ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بارے میں ہونی چاہیے۔

۷۔ اگر انٹرویو کا مقصد اس شخص کے بارے میں ہے جس سے بات کی جارہی ہے تو پھر سوالات کی نوعیت کچھ یوں ہونی چاہیے:

۱۔ جو حال سے ماضی کی طرف سفر کر کے پھر حال پر آکر ختم ہوں اور

۲۔ جن سے حال اور ماضی کے تقابل کے زیادہ امکانات ہوں۔ مثلاً براہ راست اس طرح کے سوال کرنے کے، کہ جناب آپ کچھ اپنے بچپن کے بارے میں ہمارے قارئین کو بتائیں، سوال یوں پوچھنا چاہیے کہ "جناب آج کل بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف والدین بہت زیادہ دھیان دیتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں کیا آپ کے بچپن میں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ یعنی یادوں کے سہارے قارئین کو بھی ذرا اُس دور کی جھلکیاں دکھا دیجیے"۔ یا ایک نجی سوال اس طرح بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ "صاحب مشہور قول ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیا آپ کی شخصیت کے پیچھے بھی ایسا کوئی ہاتھ ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو اُن کے بارے میں بھی ہمارے قارئین کو بتانے کی زحمت گوارا کریں۔

۸۔ یہ بات پہلے بھی کہی جاچکی ہے کہ انٹرویو میں ابتدائیہ یا آغاز کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ آغاز گھسا پٹا (Steriotype) نہیں ہونا چاہیے۔ نیچے اس سلسلے میں دو نمونے پیش کیے جارہے ہیں جن کی مدد سے ابتدائیہ کے رنگ و روپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ملاحظہ کریں۔

مثال (۱)

فرض کرلیجیے کہ یومِ اقبال یعنی علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے موقعے پر منائے جانے والے یومِ اقبال کے سلسلے میں ایک ایسی شخصیت کا انٹرویو چھاپنا مقصود ہے جس کا علامہ سے دو اعتبار سے قریبی رشتہ ہے (۱) یہ کہ موصوف نے علامہ اقبال کو دیکھا ہے اور اس زمانے میں اُن کی عمر اتنی ضرور تھی کہ وہ تاثرات کو محفوظ رکھ سکتی

تھی۔ اور (۲) آپ نے اقبال سے فطری لگاؤ کے اعتبار سے خود بھی اُن کی شخصیت اور فن پر خاصا کام کیا ہے اب یہاں پر ابتدائیہ تحریر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ اس طرح کا ہو کہ علامہ اقبال کے ساتھ ہی ساتھ موصوف کی شخصیت کا بھی ایک خاکہ قاری کے ذہن میں ابتدا ہی سے ابھر آئے۔ نیچے اب اِسی کے سلسلے کا ایک ابتدائیہ پیش کیا جارہا ہے۔

اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن اس شعر کی تخلیق کے وقت شاید انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن اُن کے اسی شعر کو لوگ انھیں کی بوقلموں شخصیت کے اعتراف کے طور پر استعمال کریں گے اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنے گل ہائے عقیدت نچھاور کریں گے۔ دنیا کا یہ روشن ستارہ آج سے ۱۲۴ برس قبل آج ہی کے دن اردو زبان و ادب کے اُفق پر رونما ہوا تھا۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ اس ستارے کی تابانی اردو دنیا کو ابدالآباد تک کے لیے وہ روشنی عطا کر دے گی جس کی چمک کبھی ماند نہ ہوگی۔ اردو کے اس مہر منور سے نہ جانے کیسے کیسے ذرّے شہاب بن کر چمکے ہیں۔ آج ہم ایسے ہی شہاب سے گفتگو کر رہے ہیں، جنھوں نے نہ صرف علامہ اقبال کو دیکھا ہے بلکہ ان کی شخصیت و فن پر خود بھی بڑے مثبت انداز میں کام کیا ہے۔ یہ ہیں ''اقبال اور کشمیر''، ''اقبال مائنڈ اور آرٹ'' اور ''رودادِ اقبال'' کے مصنف پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ آیئے سب سے پہلے ہم انھیں سے جاننے کی کوشش کریں کہ ماہر اقبالیات کی جس مسندِ فضیلت پر وہ آج براجمان ہیں اس منزل کی طرف قدم بڑھانے کی ترغیب انھیں کس نے دی۔ یعنی اقبال سے ان کے اس معنوی رشتے کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا۔ قارئین کرام آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اوپر کے اقتباس سے لے کر اُس مقام تک کہ جہاں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نام آیا ہے سارا حصہ ابتدائیہ ہے۔ اس طرح کے انٹرویو کا ابتدائیہ اگر اس سے بہتر نہ ہو سکے تو کم سے کم اس طرح کا تو ہونا ہی چاہیے۔

مثال (۲)

فرض کیجیے کہ مسودے کا تعلق کسی شخصی انٹرویو سے ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ اب کسی ایک حوالے سے انٹرویو نہیں کرنا چاہیے بلکہ پوری شخصیت کے بارے میں قارئین کو معلومات فراہم کرنی ہیں۔ پھر اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ یہ تحریر گھسی پٹی نہ ہو۔ یعنی انٹرویو کا جو عام طریقہ استعمال کیا جاتا ہے ویسا ہی اسلوب بیان یہاں بھی نہ برتا جائے۔ یعنی اس طرح سے شروع نہ کیا جائے۔

''آج ہم اپنے قارئین کو ایک ایسی شخصیت سے متعارف کرا رہے ہیں جس نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصّہ عوام کی خدمت میں صرف کیا ہے''۔

اس طرح کے آغاز کو انگریزی میں **Steriotype** کہا جاتا ہے۔ اس کی بجائے اگر آغاز یوں کیا جائے تو دل چسپی میں اضافہ ہونے کے امکانات زیادہ ہیں:-

''جس طرح عظمت کی کوئی بندھی ٹکی تعریف نہیں کی جاسکتی اسی طرح عظمت کا کوئی بندھا ٹکا پیمانہ بھی تیار نہیں کیا جاسکتا۔ عظمت ایک ایسا جوہر ہے جو مٹی میں بھی اگر چھپا ہوا ہو تو لو دینے لگتا ہے۔ چیتھڑوں میں بھی ملبوس ہو تو پنجۂ مہر کی طرح چاروں اور نور کے ہالے سے بٹتا چلا جاتا ہے۔ ایسی مقناطیسی شخصیت سے کون ملنا نہ چاہے گا۔ کون نہ چاہے گا کہ اسے ایسے برگد کی چھانو میں بیٹھنا نصیب ہو جس نے سالہا سال تک تھکے ماندے قافلوں کو فرحت عطا کی ہو۔ انھیں سکون و طمانیت کی دولت سے فیضیاب کیا ہو۔ دکھوں کی ماری ہوئی اِس دنیا میں دم بھر کے لیے ستانے اور تازہ دم ہونے کا یارا عطا کیا ہو۔ دین و دنیا دونوں حاصل کرنے کی تمنا اگر آپ کے دل میں بھی گدگدا رہی ہو تو دم بھر کے لیے اس برگد کے سایے میں ضرور آپ بیٹھیں۔ یہ برگد ہے وہ برگذیدہ ہستی جسے ساری دنیا مدر ٹریسا کے نام سے منسوب کرتی ہے''۔

۹- انٹرویو کے مسودے کے دوسرے حصے کا نام گفتگو ہے۔ اس میں کبھی سوالات کے ذریعے اور کبھی سوالات کے بغیر شخصیت کو کھلنے پر مجبور کیا جانا چاہیے۔

۱۰- شخصیت کے جو پہلو سب سے اہم ہوں ان کے بارے میں پہلے سوالات کیے جائیں۔ جو ضمنی نوعیت کے ہوں ان کے بارے میں بعد میں بات کی جائے۔ لیکن سوالات کا اسلوب گھسا پٹا نہ ہو۔ جیسے کہ ''آپ سب سے پہلے ہمارے قارئین کو اپنی پیدائش، والدین اور وطن کے بارے میں بتائیں'' کی بجائے بات یوں کی جاسکتی ہے۔

''صاحب آپ نے شعری اُفق پر جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اُن کا اعتراف برصغیر ہندو پاک میں ہی نہیں بیرونی دنیا نے بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے میں چاہوں گا کہ آپ ہمارے قارئین کو اُن محرکات کے بارے میں کچھ بتائیں جنھوں نے آپ کو اس راہِ پرخار کی طرف راغب کیا''۔

۱۱- نامہ نگار موضوع کے بارے میں اُس شخصیت سے بحث میں نہ الجھے اور نہ اس کی بات کو جھٹلانے کی کوشش کرے۔ ہاں کسی تاریخی واقعے کے بیان میں کوئی سہو ہوا ہو تو اسے درست کردے تاکہ قاری کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

۱۲- گفتگو کے دوران شخصیت کو ٹوکنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ وہ خود کم سے کم بولے، موصوف کو زیادہ بولنے دے۔ اس سے جوابات میں روانی پیدا ہوتی ہے اور صحافی اپنی شخصیت کے لب و لہجے اور اسلوب بیان کو گرفت میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

۱۳- موصوف نے جس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہو انھیں اُسی طرح رقم کردیا جائے۔ اگر گفتگو کا ترجمہ کیا جارہا ہے یعنی اسے کسی ایسی زبان میں شائع کرنا ہے جس میں گفتگو نہیں ہوئی ہے تو اس کا خیال رکھا جائے کہ ترجمے میں اصل کی روح باقی رہے۔

۱۴- انٹرویو صرف آمنے سامنے بیٹھ کر ہی نہیں لیے جاتے ہیں انھیں ٹیلی فون یا خط و کتابت کی ذریعے بھی لیا جاتا ہے۔ اگر ٹیلی فون پر لیا جارہا ہے تو بہتر ہے کہ اسے لکھنے کے ساتھ ساتھ ٹیپ بھی کرلیا جائے تاکہ تحریر کرتے وقت آسانی رہے۔ اگر انٹرویو سوال نامہ بھیج کرلیا گیا ہو تو پھر یہاں صحافی کو صرف ابتدائیہ یا اختتامیہ ہی تحریر کرنا ہے گفتگو کے حصے میں سوالوں کے حاصل شدہ جوابات درج کرنا کافی

ہیں۔ یہاں دقت یہ ہے کہ بات چیت کے دوران جو مزید وضاحتیں صحافی حاصل کر لیتا ہے سوال نامے میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۱۵- انٹرویو کا آخری حصہ اختتامیہ ہوتا ہے۔ اسے کسی ایسے نکتے پر ختم کرنا ضروری ہے جو قارئین کو ہمیشہ یاد رہے۔

۱۶- انٹرویو اگر کسی ہنگامی موضوع سے متعلق ہے تو پھر بہتر ہے کہ اختتام آخری سوال کے جواب کے ساتھ ہی واقع ہو۔ اس کے بعد نامہ نگار اپنی طرف سے انٹرویو کے بارے میں تبصرہ نہ کرے۔

۱۷- اگر انٹرویو کا تعلق کسی شخصیت سے ہے تو پھر آخری سوال کے بعد ایک پیرا بڑھا دیا جائے۔ جس میں متعلقہ شخصیت کے اُن پہلوؤں کا ذکر کیا جائے جن کے بارے میں بات نہ ہو سکی اور کسی دوسری ملاقات میں اُنھیں سمیٹنے کے وعدے کے ساتھ پیرا ختم کر دیا جائے۔

# فیچر اور فیچر مضمون

سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی کارکردگی سے عوام الناس کو روشناس کرانے کے لیے مختلف طریقے برتے جاتے ہیں۔ خبری کہانی کی وساطت سے انھیں پیش کرنا ایک طریقہ ہے۔اُن کی کامرانیوں کو اشتہاروں کے ذریعے سے بھی خاص و عام تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

ایک مشکل لیکن زیادہ مؤثر طریقہ فیچر تیار کرنا ہے۔ میڈیا کے حوالے سے انھیں تیار کرنے اور پیش کرنے کے لیے زیادہ وقت اور جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخبار کے اداروں میں اس کام کے لیے اُس کا اپنا اسٹاف ہوتا ہے۔ اس لیے اشتہار دینے والے افراد کے لیے اخباروں میں اپنے فیچر شائع کرانا قدرے مشکل کام ہوتا ہے۔ تاہم اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو تو یہ اشتہاروں یا خبروں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

فیچر کے دو اہم کردار ہوتے ہیں۔ یہ خبری کہانی کی معاونت (Supplement) کرتے ہیں۔ کبھی کبھی خبر کے ذریعے پیش کی گئی کسی بات کی طرف لوگ زیادہ دھیان نہیں دیتے چناں چہ اسی بات کو فیچر کے ذریعے پیش کرکے زیادہ توجہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

فیچر کے معنی کیا ہیں اور یہ خبری کہانی یا دوسری تبصراتی خبروں یا مضامین سے کس طرح مختلف ہوتے ہیں؟ انھیں کس طرح تیار کیا جاتا ہے اور کیسے مارکیٹ کیا جاتا ہے۔ (منڈی میں چلایا / پہنچایا جاسکتا ہے؟) ان پہلوؤں پر توجہ دینا ہی دراصل اس تحریر کا مقصد ہے۔

فیچر اگرچہ صحافیوں میں بہت ہی معروف اصطلاح ہے اس کے باوجود یہ شاید کوئی بھی نہ بتا سکے کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ اس کے مقاصد، نام، قسم اور دوسرے متعلقہ امور سے متعلق ان میں اتفاق رائے بھی نہیں ہے۔ مسٹر برائن نکولس نے اپنی کتاب Features with Flair میں اس کے جو عناصر ترکیبی بیان کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ خبری کہنہ خیالات یا حقائق کو پیش کرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن فیچر کی کہانی

آگے بڑھتی ہے۔ وہ پس منظر، واقعے یا خیال کے آغاز و ارتقا کو دریافت کرتی ہے اور مستقبل کی بھی ایک جھلک دکھاتی ہے۔ یہ قارئین کو بتاتی ہے کہ وہ یا لکھنے والا یا کوئی دوسرا اس واقعے یا خیال کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ یہ قاری کے خیال کو زیادہ پسند آتا ہے۔

۲- فیچر کی کہانی حقائق کا محض بیان نہیں ہوتی بلکہ حقائق اور اُن سے وابستہ خیالات کی شاطرانہ یا چالاک پیش کش ہوتی ہے تاکہ اُن گوشوں کو روشن کیا جا سکے جو اہم تو ہوتے ہیں پر سرسری طور پر دیکھنے والے کو نظر نہیں آتے۔

۳- فیچر، خبری کہانی کی کائنات سے باہر یا اُس سے کہیں زیادہ متاثر کرتا ہے اور اُس کے کیا، کیوں، کس طرح، کہاں ایسے سوالات سے زیادہ دور تک نفوذ کرتا ہے۔

۴- فیچر کا جواز، اس کی قوت یہاں تک کہ اُس کی شناخت تک کا انحصار خیال کی پیش کش پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقت سے کنارہ کش ہونے یا اسے زیادہ کھینچنے میں بلکہ ان مخصوص صداقتوں کو چھیدنے میں جو لوگوں کو تجسس، ہمدردی، شبہے، مزاح، نفرت اور حیرانی ایسی کیفیات سے دوچار کرتی ہیں۔

۵- فیچر اس اعتبار سے خبری کہانی کی طرح ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو بڑے دل چسپ انداز میں حقائق تک پہنچاتا ہے اور بڑی روانی سے پڑھا جا سکتا ہے لیکن وہ مطالعے، تحقیق اور انٹرویو سے مفصل بن کر اور اس موضوع کو جاننے اور نہ جاننے والوں کی تعلیم و تربیت، رہبری اور محظوظ کرنے کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان حقائق سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

۶- اسے کسی دل چسپ موضوع کی مقبول ہیئت میں جامع پیش کش کہہ سکتے ہیں۔ اس کا تعلق اُس روز کی خبر، کسی وقتی یا موسمیاتی موضوع یا کسی بھی ایسے موضوع سے ہوتا ہے جس کو خاصی تعداد میں قارئین پسند کرتے ہوں۔

۷- خبری کہانی اور فیچر اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں پر یہ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

۸- فیچر: اخبار میں قدرے طویل ٹکڑے، ایک ایسی تحریر جو مسائل کو مطالعے، تحقیق اور انٹرویو کی مدد سے جامع بناتی اور واضح کرتی ہے۔

۹۔ حقائق کی دید و دریافت جس کا مقصد رہبری کرنا، تعلیم دینا یا محظوظ کرنا ہوتا ہے۔

فیچر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے توضیحی خبر اور فیچر کے درمیانی فرق کو ٹھیک طرح سے سمجھیں۔ تاہم اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ان دونوں کو قطعی طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی یہ ایک دوسرے کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود فیچر میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہیں۔

خبر واقعات کا معروضی اور بے کم و کاست بیان ہوتا ہے جس میں نامہ نگار حقائق تک خود کو محدود رکھتے ہوئے اُن بنیادی چھے سوالوں کے جواب دیتا ہے جو اسے خبری کہانی بناتے ہیں۔ اُس کا مقصد حقائق پیش کر کے دل چسپ معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔

فیچر دوسری طرف خبری کہانی سے بہت آگے جاتا ہے۔ وہ خبر کو نئی جہت عطا کرتا ہے۔ وہ خبر کا جائزہ ایک جراح کی طرح لیتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ پس منظر کو دریافت کرتا ہے۔ کسی واقعے یا خیال کی کھوج کرتا ہے یا چھان بین کرتا ہے۔ اُس کا مقصد اطلاع دینے اور محظوظ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ قارئین میں تجسس، ہمدردی، مزاح اور دوسرے جذبات کو متحرک کرنا ہوتا ہے۔ اس کا دائرۂ عمل خبر سے کہیں وسیع ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ہوائی جہاز کے ایک حادثے کو لیجیے۔ خبر کا جہاں تک تعلق ہے وہ حادثے سے متعلق حقائق اور دوسرے متعلقات کے بارے میں کب، کہاں، کیسے اور کیوں ایسے سوالات کا جواب دے گی لیکن فیچر نگار خبر کے اُن پہلوؤں کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کرے گا جنھیں خبر نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً حادثے کے بارے میں بچنے والوں اور اُن کے رشتے داروں کا ردِ عمل، ایسے ہی حادثے کا پس منظر، اڑان بھرنے سے پہلے جہاز کا تکنیکی معائنہ اور اُس کی خامیاں۔ دوسری ہوائی کمپنیوں میں ہوئے ہوائی حادثوں سے تقابل۔ اشیا کی گم شدگی اور ہوائی عملے کا برتاؤ وغیرہ فیچر کے دل چسپ پہلو ہوں گے۔

اسی طرح جہاز کے ایک اغوا کے بارے میں جہاں خبر محض ٹھوس حقائق کو پیش کرے گی وہاں فیچر مسافروں، اُن کے رشتے داروں اور پائلٹ کے تجربات اور احساسات کو بھی پیش کرے گا۔

فیچر، خبر سے اور بھی کئی طرح سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً اس کا حجم، اسلوب اور عصریت خبر

سے مختلف ہوتی ہے۔ خبری کہانی حالیہ اور تازہ ترین واقعے کو پیش کرتی ہے۔ یہ ڈیری میں بنائی جانے والی اشیا کی طرح ہوتی ہے جو جلد ہی خراب ہو جاتی ہیں۔ اس میں رفتار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اسے کسی نہ کسی آخری تاریخ کی حد کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن فیچر کے سلسلے میں یہ ضروری نہیں ہے۔ فیچر کے لیے اس کا صرف تازہ ترین موضوع پر ہی مبنی ہونا ضروری نہیں ہے۔ واقعہ چاہے کچھ مدت پہلے ہی کیوں نہ ہوا ہو اُسے فیچر کا موضوع بنایا جاسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قارئین کو اس سے دل چسپی ہو۔

ایجاز و اختصار خبر کی روح ہے۔ خبری کہانی کے پاس پس منظر یا دوسری تفصیلات کے لیے گنجائش نہیں ہوتی۔ خبر میں ہر لفظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے فیچر نگار کے پاس زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ وہ کچھ حد تک صحیح کو اپنی ضرورت کے مطابق رکھ سکتا ہے۔ فیچر خبر کے مقابلے میں یقیناً زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔

اخبار کے طباعت کے مقام سے قریب تر ہونے والے واقعات کی خبر میں بڑی اہمیت ہے۔ لیکن فیچر کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔ فیچر کا مصنف قارئین کو دُور کی سیر بھی کرا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ قارئین کی دل چسپی کو برقرار رکھ سکے۔

فیچر اور خبر تحریر کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ چوں کہ جلدی جلدی لکھی گئی ہوتی ہے اس لیے اس میں وہ حسن پیدا نہیں ہوپاتا جو فیچر میں ممکن ہوتا ہے کیوں کہ اس پر وقت کا جبر مسلط نہیں ہوتا۔ خبر کا اسلوب ایجاز و اختصار اور حقائق کے سیدھے سادے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں تزئین کی گنجائش نہیں ہوتی۔

فیچر میں مصنف کے پاس خاصی آزادی ہوتی ہے۔ وہ صورتِ حالات کے بارے میں بڑی آزادی سے عمل کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ فیچر کو رنگین اور کہانی کے اسلوب میں لکھا جاسکتا ہے۔ وہ بڑے دل چسپ، پر لطف اور موثر انداز میں اپنے خیالات پیش کرسکتا ہے۔ وہ اپنا کوئی منفرد اسلوب بنا سکتا ہے یا پھر وہ بے تکلف اسلوب کی مدد سے قارئین کو اپنا شریک بنا سکتا ہے۔

خبر لکھتے وقت نامہ نگار اس کا عنوان نہیں دیتا۔ یہ کام سب ایڈیٹر کرتا ہے۔ فیچر میں عنوان کا انتخاب ایک اہم پہلو تصور کیا جاتا ہے اور یہ کام فیچر نگار خود کرتا ہے۔ یہ ایسا ہونا چاہیے جو فوری طور پر قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو جائے۔

فیچر کے ابتدائیے میں خبر کی طرح خلاصہ نہیں ہوتا۔ یہاں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے

اسلوب سادہ اور بلاواسطہ ہو سکتا ہے۔ ابتدائیے میں جہاں مرکزی خیال کے ساتھ ساتھ اس کی حدود کی وضاحت دی جا سکتی ہے وہاں فیچر کو کسی مثال، قول، مکالمے یا دلچسپ گفتگو سے شروع کیا جا سکتا ہے لیکن اُس کا موضوع سے تعلق ہونا ضروری ہے۔

فیچر کے حجم کا دارومدار اخبار کی ضرورت پر ہوتا ہے۔ اس کے صفحے کے سائز کا بھی اس پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ ان میں تحقیقات کو کم سے کم استعمال کیا جانا چاہیے۔ ان کے اقتباسات یا پیرے بھی خبر سے طویل ہوتے ہیں۔ اس کا اسلوب ادبی، رنگین اور مزین ہو سکتا ہے۔ فیچر اپنے اندر مکمل ہوتا ہے۔

خبریں لکھنے والے کا نام نہیں ہوتا جب کہ فیچر میں مصنف کا نام ہوتا ہے۔ خبر صیغۂ واحد غائب متکلم (تھرڈ پرسن) میں لکھی جاتی ہے جب کہ فیچر تینوں صیغوں کو استعمال کرتا ہے۔

فیچر اور مضمون میں بہت سی خصوصیات مشترک ہونے کے باوجود دونوں کی شخصیات منفرد ہیں۔ مضمون اور فیچر دونوں کے اسالیب تحریر خبر کے اسلوب سے خارج تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کا دارومدار نثری اسلوب کی خوبی پر ہوتا ہے۔ کبھی فیچر مضمون کے عناصر اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی مضمون فیچر کے، تاہم ان مشترک عناصر کے باوجود کچھ پہلو دونوں میں ایسے بھی ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ مثلاً مضامین وسیع نوعیت کے موضوعات پر لکھے جاتے ہیں جو کسی مضمون کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، جب کہ فیچر تحقیقی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ کسی مخصوص پہلو پر گہرائی سے نظر ڈالتا ہے۔ اس طرح اس کا دائرۂ عمل محدود ہو جاتا ہے۔ اُس میں ایک یا زیادہ سے زیادہ کسی موضوع کے دو پہلوؤں کو موضوع بنایا جاتا ہے، کسی ایک ذہنی کیفیت کو بیان کیا جاتا ہے۔ مضمون میں طریقۂ کار مجموعی نوعیت کا ہوتا ہے جب کہ فیچر میں یہ خصوصی نوعیت اختیار کرتا ہے۔ مضمون مفصل ہوتا ہے جس میں مطالعہ اور تحقیق کی داد دی جاتی ہے یہ زیادہ اسکالرلی اور سنجیدہ نوعیت کا حامل ہوتا ہے، جسے پورے شواہد کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس میں حقائق، اعداد و شمار اور ہندسے ہوتے ہیں۔ فیچر دل کی پیداوار ہوتا ہے جس کا انحصار جذبوں اور احساسات کے ساتھ ہی ساتھ فیچر نگار کے اُن ردِ اعمال پر ہوتا ہے جن کا مظاہرہ وہ لوگوں، جگہوں اور واقعات کے سلسلے میں کرتا ہے۔ یہ بہت ہی ہلکے پھلکے طربیہ، مزاحیہ اور لطیف پیرائے میں تحریر کیا جاتا ہے۔ فیچر میں حقائق اور ہندسے اتنے اہم نہیں ہوتے۔

حجم کے اعتبار سے بھی مضمون فیچر سے طویل ہو سکتا ہے۔ اس میں معلوماتی اور تعلیمی مواد

کے ساتھ ہی ساتھ تفننِ طبع کے سامان بھی ہوتے ہیں۔ مضمون کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ تعلیمی یا تفریحی سامان بھی فراہم کرے۔

مضمون کا اسلوب عام طور پر پُر تکلف، معیاری، بھرکم، سنجیدہ اور مطالعاتی ہوتا ہے۔ یہ دل چسپ نہ ہوتے ہوئے بھی چل جاتا ہے۔ فیچر میں اسلوب زیادہ بے تکلفانہ اور رنگین ہوتا ہے۔ پھیکاپن اس کے لیے مہلک ہوتا ہے۔ فیچر کسی واقعے یا خیال کو ڈرامائی انداز میں پیش کرکے قارئین کے لیے حظ و انبساط کے سامان فراہم کر سکتا ہے تاکہ وہ ان کو زیادہ پسند آئے۔

مضامین میں ذاتی رائے کا عنصر شامل رہتا ہے کیوں کہ وہ اکثر ایسے لوگوں نے لکھے ہوتے ہیں جو اپنے موضوع پر ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں۔ مضمون کا ماہر تحقیق و مطالعے کے بعد اپنی رائے دیتا یا نتائج اخذ کرتا ہے۔ فیچر میں ذاتی رائے بھی دوسروں کی وساطت سے پیش کی جاتی ہے۔ مضمون آغاز، درمیان اور انجام کی روایتی اسلوب کے مطابق لکھا جاتا ہے جب کہ فیچر اچانک شروع یا ختم ہو سکتا ہے۔

فیچر کو نثری غزل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ الفاظ میں پیش کی گئی ایک وقتی کیفیت مزاج۔ مضمون بیک وقت بہت سے کیفیتوں کا احاطہ کرتا ہے۔

ان دونوں کے فرق کو ایک مثال سے مزید واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہندوستان میں گداگری کے عنوان سے ایک مضمون لکھنا مقصود ہو تو مضمون نگار پوری صورتِ حال کا جائزہ لے گا۔ ضروری اعداد و شمار دے کر یہ بتانے کی کوشش کرے گا کہ اس سلسلے میں اب تک حکومت یا رضا کارانہ اداروں نے کیا کیا کیا ہے۔ یہ مسئلے کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرے گا۔ لیکن اگر اسی موضوع پر فیچر لکھنا مقصود ہے تو فیچر نگار ایک گداگر اور اس کے کنبے کے افراد کی حقیقی زندگی کی تصویر اتار کر مسئلے کی صحیح صورتِ حال آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ وہ گداگری کی جیتی جاگتی تصویر آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ اس میں تحریری شواہد کی اگر ضرورت ہوگی بھی تو وہ ضمنی حیثیت کی حامل ہوگی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے فیچر کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ فیچر نگار کے پاس تخیل اور ضروری ذہنی میلان ہو۔ جس طرح فیچر، توضیحی خبر اور مضمون کے درمیان فرق کرنا قدرے مشکل کام ہے اسی طرح فیچر کی مختلف اقسام کی وضاحت کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ چناں چہ فیچر کی مختلف اقسام کو قطعی یا حتمی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایک

سادہ سی تقسیم کی جاسکتی ہے جس سے مواد کو جمع کرنے میں مدد مل سکے۔

فیچر کو ہم دو طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً کچھ فیچر ایسے ہو سکتے ہیں جن کا دارومدار اسلوب پر ہو۔ فیچر کا دارومدار اگر انٹرویو پر ہو یعنی اُس کا زیادہ حصہ گفتگو پر مشتمل ہو تو اسے انٹرویو فیچر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخصیتی یا بیانیہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح فیچرس کو ان کے مقاصد کے اعتبار سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسے وضاحتی فیچر جس میں کسی عصری موضوع کی وضاحت کی گئی ہو۔ توصیفی فیچر جس میں دل چسپ انسانوں، جگہوں اور چیزوں کی لفظی تصویر پیش کی گئی ہو۔ بیانیہ فیچر جس میں واقعات کو پلاٹ، پس منظر اور کرداروں کے سمیت بیان کیا گیا ہو۔

فیچر کی جو قسم سب سے عام ہے وہ "خبری فیچر" ہے۔ اس قسم کے فیچروں کا تعلق خبروں سے ہوتا ہے اور انھیں لکھنے کی تحریک بھی خبروں سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہو سکتی ہیں:

پرائم منسٹر کا دورۂ امریکہ۔ اس موضوع پر فیچر میں اُن لوگوں کے قلمی چہرے پیش کیے جائیں گے جن سے پرائم منسٹر اس دورے کے دوران ملیں گے۔ اسی طرح کسی کسان کے بارے میں چھپی اس خبر سے کہ اُس نے بہترین فصل اُگائی ہے اس قسم کا فیچر لکھا جا سکتا ہے جس میں فصل اُگانے کے مختلف طریقوں کو موضوع بنایا گیا ہو۔

ایسے فیچر بھی لکھے جا سکتے ہیں جن کا گو کسی خاص خبر سے تعلق نہ ہو لیکن وہ عوام کے لیے مسلسل دل چسپی کا باعث ہوں۔ مثلاً دھویں کی کثافت، سڑکوں پر فقط جھگی جھونپڑیاں وغیرہ۔

دیوی دیوتاؤں یا مذہبی تہواروں سے تعلق رکھنے والے فیچر اساطیری فیچر کے زمرے میں آتے ہیں۔

فیچر کی ایک اور قسم وہ ہے جس میں کسی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہو۔ اس میں متعلقہ شخصیت کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ کس بات نے موصوف کو بڑا آدمی بنایا ہے اس پر زیادہ زور ہوتا ہے بجائے ساری کامیابیوں کی فہرست مرتب کرنے کے۔

شخصیتی فیچر صرف اُن بڑے لوگوں کے بارے میں ہی نہیں لکھے جاتے جن کا ذکر اکثر خبروں

میں ہوتا ہے یا جو عوام کے تخیل کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی لکھے جاتے ہیں جیسے ایک بھکاری کا لکھ پتی بن جانا۔ جنم سے مرنے تک کے واقعات کو بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ اتنا کافی ہے کہ فرد کے پس منظر کے بعد اس کے کارناموں کا ذکر کر دیا جائے۔ اس کا مقصد قارئین کو متذکرہ شخصیت کی خوبیاں گنا کر یہ بتانا ہے کہ وہ کس طرح شہرت کے بامِ عروج تک پہنچا ہے۔

انسانی دل چسپی کے فیچر بھی اب ہمارے ملک میں کافی دل چسپی کا باعث ثابت ہو رہے ہیں۔ اس طرح کے فیچر کسی عام آدمی کی زندگی کے ایک دن کی سرگرمیوں پر لکھے جا سکتے ہیں جیسے کہ کسی سپاہی، مالی، صفائی والے یا بھکاری یا ۹۰ سال کا کوئی بوڑھا جس نے پانچویں بار شادی کی ہو۔ یا کوئی اندھا استاد جو کلاس کو پڑھا رہا ہو۔ اس طرح کے فیچروں میں زیادہ زور زندگی کے کسی غیر معمولی پہلو پر ہوتا ہے یا کوئی غیر معمولی پیشہ۔

کسی کام کو کرنے کے گر بتانے والے فیچر۔ جیسے ریڈیو، ٹی.وی تیار کرنے یا اس کی مرمت کرنے کے فن پر فیچر۔ باغبانی، بچوں کی پرورش، صحت، اچھی عادتیں، کھانے کی کئی کئی قسم کو تیار کرنے کے بارے میں، گڑیوں کو بنانا وغیرہ۔ ان فیچروں میں ہدایات سادہ اور واضح ہونی چاہئیں تاکہ سننے والے ان پر عمل کریں۔

تجرباتی فیچر تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے تجربات پر مبنی لوگوں کے، گروہوں کے تجربات / گروہی تجربات اور ایسے تجربات جو اعتراافاتی نوعیت کے ہوں۔ تجربہ غیر معمولی ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ایسے لوگوں کا تجربہ جن کا جہاز اغوا کر لیا گیا ہو یا جو جہاز کے کسی حادثے میں بال بال بچے ہوں۔

اسی طرح جگہوں، اشغال، پالتو جانوروں اور سائنسی موضوعات پر بھی فیچر تیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی ایسی جگہ کہ جو خاصی بدل چکی ہو یا سیاحوں کی دل چسپی کے مقامات بھی مناسب موضوعات ہو سکتے ہیں۔

چڑیا گھر میں کسی نئے جانور کی آمد کے بارے میں بھی فیچر تیار کیا جا سکتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی نئی پیش رفت کو بھی آسان اور سادہ طریقے سے عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ جو ریٹائر ہو چکے ہوں ان کے اشغال پر فیچر بنائے جا سکتے ہیں۔

فوٹو فیچر بھی فیچر کی ایک اور قسم ہے جس میں تصویروں کو ایک ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے جو خود بخود کہانی بیان کرتی ہیں۔ ایسے فیچروں میں تحریر بہت ہی کم ہوتی ہے۔

اداروں پر بھی فیچر تیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کسی یونی ورسٹی، فیکٹری یا ورکشاپ پر فیچر تیار کیے جا سکتے ہیں۔

بیانیہ فیچر حقائق کو واضح طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ کوئی سفری مشاہدہ ہو سکتا ہے یا جنگ کے میدان میں آنکھوں دیکھے واقعات ہو سکتے ہیں۔

فیچر آرٹیکل یا فیچر مضمون کی تیاری کے لیے جن امور کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱- موضوع مخصوص نوعیت کا ہونا چاہیے نہ کہ عمومی نوعیت کا نیز محدود بھی ہونا چاہیے۔

۲- مسئلے کے کسی ایک یا دو پہلوؤں سے تعلق ہو۔

۳- کسی مخصوص زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا ہو۔ یہ کام فیچر کے مقصد اور جس اخبار میں چھپنا ہے اس کی Category کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔ اگر اسے روزناموں کے لیے لکھنا ہے تو موضوع خاص و عام کی دل چسپی کا ہونا چاہیے۔ کسی عصری واقعے سے تعلق رکھنا چاہیے۔

۴- موضوع کا انتخاب کرتے وقت مواد کی فراہمی کو بھی سامنے رکھنا چاہیے آیا اس کے بارے میں مواد موجود بھی ہے یا نہیں۔

فیچر مضمون لکھنے کی دوسری منزل مواد کی فراہمی ہے۔ فیچر نگار کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے فیچر میں ایسی باتیں کہے جو اب تک نہ کہی گئی ہوں۔ اس سلسلے میں اُسے حوالہ جاتی کتابوں، قاموسوں، ڈائریکٹریوں اور سرکاری مطبوعات کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ تازہ ترین معلومات حاصل کر سکے۔

موضوع سے متعلق چھپے مضامین کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لوگوں سے ملاقات کر کے ان کے انٹرویو لیے جا سکتے ہیں۔

فیچر نگار کا اپنا منفرد اسلوب ہونا بھی ضروری ہے جو رنگین، بیانیہ اور تصوراتی ہو تو بہتر ہے۔

حجم کا انحصار بھی اخبار پر ہے۔ ابہام اور غیر دل چسپی اس کے لیے مہلک ہوتے ہیں۔ فوٹو اور تصویریں ہونا بھی ضروری ہے۔

اسے بار بار پڑھنا چاہیے تاکہ غیر ضروری حصوں کو نکال باہر کیا جا سکے۔

فیچر مضمون کی ظاہرہ صورت بھی توجہ طلب ہونا چاہیے۔ اچھا کاغذ، اچھا ٹائپ، مناسب حاشیے اور مناسب عنوان ضروری ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اخبار نویس، صحافی یا نامہ نگار اس مشکل سے دو چار ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس قاری کی توجہ اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کوئی دل چسپ خبر یا مسالہ نہیں ہے۔ اس صورتِ حال سے وہ بخوبی اُسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ اس فن سے آشنا ہو کہ کس طرح ایک روکھی پھیکی خبر کو دل چسپ فیچر خصوصاً انسانی فیچر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف وہ اخبار کے کالموں میں جگہ پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ دوسروں کو متاثر کرنے میں بھی سرخرو ہوتا ہے۔ مثلاً اگر خبر کا تعلق کسی ایسی تقریب سے ہے کہ جسے ہم جلسہ تقسیم اسناد کہہ سکتے ہیں تو ظاہر ہے اس خبر میں دل چسپی کے سامان بہت کم ہوں گے۔ لیکن صحافی یا فیچر نگار تقسیم اسناد میں حصہ لینے والوں کے انٹرویو لے کر اور مستقبل کے بارے میں ان کے منصوبوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس روکھی پھیکی خبر کو ایک دل چسپ فیچر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ہر خبر میں موجود انسانی عنصر کو بنیاد بنا کر وہ دلچسپ فیچر تیار کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے فن سے بخوبی واقف ہو۔

خود اختیاری وسائل روزگار پر اگر فیچر تیار کرنا مقصود ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس طرف لوگ توجہ دیں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو تو صحافی کو چند کامیاب خود اختیاری پیشہ وروں کے انٹرویو لے کر پیش کرنے پڑیں گے۔ چھوٹی دستکاریوں کے منصوبے اختیار کرنے والے ان کامیاب لوگوں کی کہانیاں نوجوانوں کو اس طرف راغب کرنے کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہیں۔